شمارہ
۲۰

۱۵/اگست تا ۳۱/اگست ۲۰۲۶ء

آزادئ ہند نمبر

پندرہ روزہ

آن لائن

اُردو گلبن (جدہ)

(خالص ادبی ومعاشرتی رسالہ)

ہم نے خوشبو کے بند کھول دیئے
اب ہوا تیری ذمہ داری ہے

مدیر اعلیٰ: مہتاب قدر

آزادی ہند یادگاری ٹکٹ

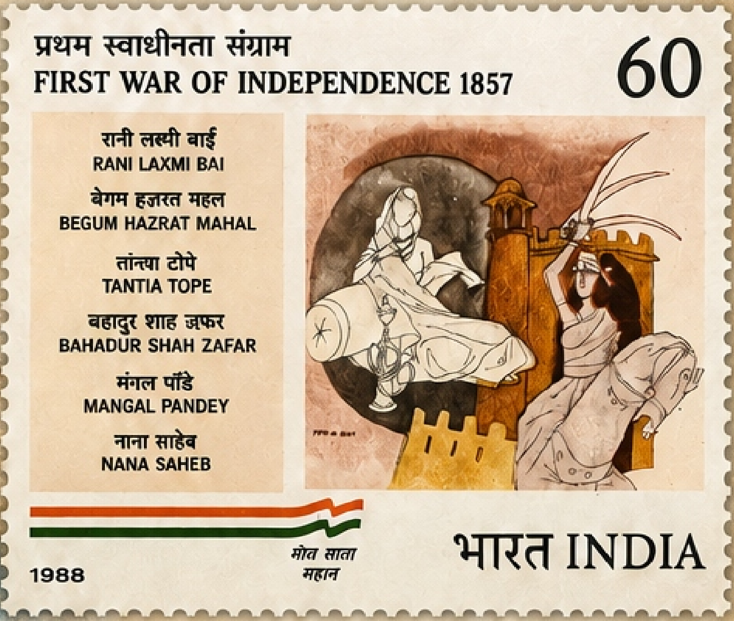

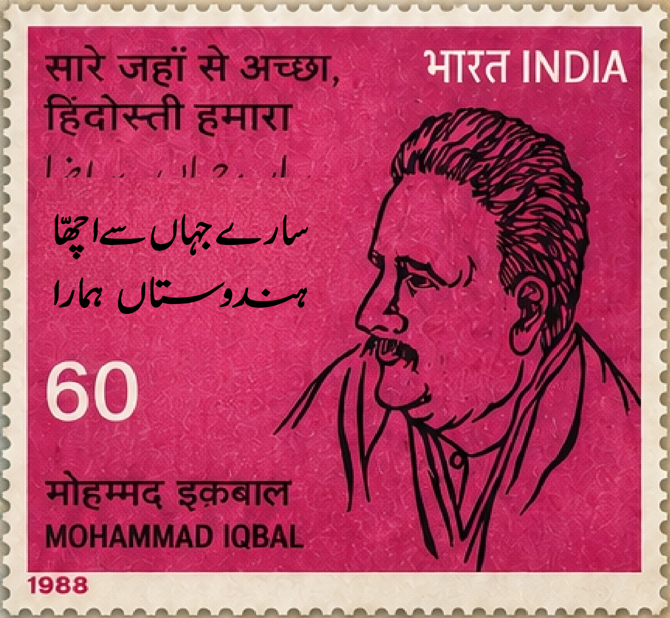

مجلس ادارت

پروفیسر ارتضیٰ کریم

مہتاب قدر

مرزا محمد نواب

افسر حسین

اسلم افغانی

تاشقین سیّد

فیصل طفیل

مجلس مشاورت

نعیم جاوید	(دمام الخبر)
افتخار راغب	(ریاض)
محمد سیف الدین	(ریاض)
ناصر برنی	(ینبع)
محمد ہاشم علی	(حیدرآباد)
سراج وہاب	(جدہ)
افسر فہیم	(امریکہ)
دانش عبدالغفور	(ریاض)
مسعود حساس	(کویت)
عزیز الرب علیگ	(جدہ)
اعجاز شاہین	(امارات)

پندرہ روزہ

اُردو گلبن

(خالص ادبی و معاشرتی رسالہ)

اشاعت کی شرائط

۱۔ مضمون زبان و بیان کے اعتبار سے مبہم اور پیچیدہ نہ ہو۔

۲۔ مضمون کا زیادہ تر مواد ماخوذ و مستفاد نہ ہو اور حوالے ساتھ نقل کیے جائیں۔

۳۔ مضمون میں موضوع سے متعلق کما حقہ احاطہ کیا گیا ہو۔

۴۔ اقتباسات/اشعار ضرورت سے زیادہ نہ ہوں، مضمون نگار کی اپنی تحریر زیادہ ہو۔

۵۔ مضمون رسالہ کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو؛ یعنی تحریر سے کسی کی دل آزاری یا ہجو مقصود نہ ہو۔

۶۔ مضمون میں ترجیحاً کوئی نیا زاویہ یا نئی جہت ہونی چاہیے۔

۷۔ مضمون نہایت مختصر یا بہت طویل نہ ہو۔

۸۔ مضمون نگار اپنی پاسپورٹ سائز تصویر، پورا پتہ، اور مراسلت کے لیے ای میل و فون نمبر بھی ارسال فرمائیں۔

مہتاب قدر
مدیر اعلیٰ
Email: mahtabqadr@gmail.com
Whatsapp: +966 50 132 9193

مرزا محمد نواب
Email: mirza_shanov@hotmail.com
Whatsapp: +966 50 8509457

تزئین کار محمد سلیمان طاہر

توجہ طلب: پندرہ روزہ آن لائن اُردو گلبن رسالے میں شائع ہونے والے تمام مضامین قلم کاروں کے اپنے ذاتی خیالات ہیں اور وہ خود ان کے ذمہ دار، کسی بھی تحریر سے کسی کی تضحیک یا ہجو منظور نہیں اور یہ مطلق ضروری نہیں کہ ادارہ اُردو گلبن قلم کاروں کی نگارشات سے اتفاق کرے۔

حُسنِ ترتیب

قرآنی آیت		4
حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)		4
اداریہ: ''آزادی بنیادی حق ہے''	مہتاب قدر (جدہ)	5
حمدِ رب کریم ''حمد کرتا ہوا بہ چشمِ نم''	اطہر عباسی (جدہ)	7
نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ''موزوں کلام میں جو ثنائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوئی''	ابوالکلام آزاد	7
نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ''تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں''	مولانا محمد علی جوہر	7

مجاہدین آزادی پر ڈاک ٹکٹ	مرزا محمد نواب (جدہ)	8

(نظمیں/غزلیں)

اے زمینِ وطن (نظم)	شجاع الدین شاہد (ممبئی)	14
نیا سویرا (نظم)	احمد شاذ قادری	14
چیخا، نہ بول پایا دہائی نہ دے سکا (غزل)	آبِص باغی (ملائیشیا)	15
لالہ وگل کے داغ بھر بھی نہیں (غزل)	خالد ہاشمی	15
جینے کو یوں تو جیتے ہیں ناداں ترے بغیر	نذیر راہی (کولکاتا)	15

(مضامین)

ریشمی رومال تحریک: برصغیر کی آزادی کی ایک خفیہ انقلابی جدوجہد		16
گاندھی، نہرو، مولانا آزاد اور پٹیل: جدوجہدِ آزادی کی چار مختلف مگر باہم مربوط جہتوں کے نمائندے		18
برصغیر کی جدوجہدِ آزادی میں مسلم علماء کا کردار		22
علمائے ہند: مذہبی شناخت کے محافظ اور تحریکِ آزادی کے معمار	انجم اقبلہ (مکہ مکرمہ)	24
مولانا برکت اللہ بھوپالی: برطانوی ہندوستان کے آزاد و متحرک سفارت کار	ڈاکٹر حسن مدنی ندوی (انڈونیشیا)	27
ہندوستان کی آزادی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا کردار	محمد ابوبکر (مونگیر۔ہندوستان)	32
پندرہ اگست اور ایک عورت کے سوال	ڈاکٹر رفیعہ نوشین (حیدرآباد)	38
بیداریٔ آزادی کے نقیب ''اُردو اخبارات''	فرخندہ ضمیر (اجمیر)	40
قاضی عبدالغفار کا ''جمہور'' تحریک آزادی کا علمبردار اخبار	ڈاکٹر تسلیم عارف (بھاگل پور)	44

(افسانچہ)

قربانی (افسانچہ)	ڈاکٹر اظہر حیات (ناگپور)	50

(ادبی خبریں)

ڈاکٹر اظہر حیات ''ودربھ گورو پرسکار'' سے سرفراز		51

(آپ کے خطوط)

خط۱: شمارہ باصرہ	محمد مجیب احمد (حیدرآباد، تلنگانہ)	52
۲۔ معلوماتی و دیدہ زیب	تاشقین سید (جدہ)	52
۳۔ بلند معیار رسالہ	بدرالدین کامل (حیدرآباد)	52
۴۔ اثاثہ	محمد نعمان چشتی (پاکستان)	52

آزادی ایک نعمت ہے!

قرآنی آیت

قرآن انسان کو بااختیار بناتا ہے جو اچھے اور برے راستے میں سے خود کسی ایک کا انتخاب کرتا ہے۔
عقیدے اور ضمیر کی آزادی قرآن نے واضح کیا کہ دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے؛
انسان حق یا باطل کا انتخاب کرنے میں خود مختار ہے۔ارشادِ باری تعالی ہے:

لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ

(ترجمہ:''دین میں کوئی زبردستی نہیں)-(سورۃ البقرہ:256)۔

پیغمبرِ اسلام کو بھی مخاطب کر کے کہا گیا کہ آپ لوگوں پر جبر کرنے والے نہیں ہیں:

أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (سورۃ یونس:99)

عمل اور ارادے کی آزادیانسان کو اچھے اور برے راستے کی تمیز اور دونوں کا اختیار دیا گیا ہے:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا

(ترجمہ: ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، اب خواہ وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا)-(سورۃ الدہر:3)۔

انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے کیونکہ اسے ارادہ اور عقل کی آزادی بخشی گئی ہے
جو درحقیقت نفسانی خواہشات اور طاغوتی جبر سے حقیقی آزادی ہے

حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے جس نے بھی اس حال میں صبح کی کہ وہ اپنے گھر یا قوم میں امن سے ہو
اور جسمانی لحاظ سے بالکل تندرست ہو اور دن بھر کی روزی اس کے پاس موجود ہو تو
گویا اس کے لیے پوری دنیا سمیٹ دی گئی۔''

[جامع ترمذی 2346]

شعر

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور
(اقبال)

آزادی بنیادی حق ہے

اداریہ

آزادی انسان کا بنیادی اور فطری حق ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو انسان کو سوچنے، اظہار کرنے، سیکھنے، تخلیق کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

جہاں آزادی میسر ہو وہاں علم پروان چڑھتا ہے، اَدب پھلتا پھولتا ہے، فنونِ لطیفہ نکھرتے ہیں اور معاشرے میں فکری بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب آزادیٔ فکر و اظہار محدود ہو جائے تو تخلیقی قوتیں ماند پڑ جاتی ہیں اور معاشرہ جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔

قوت فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے
تب کسی قوم کی شوکت پہ زوال آتا ہے

اَدب ہمیشہ آزادی کا علم بردار رہا ہے۔ ہر دَور کے شاعر، ادیب اور دانشور نے ظلم، جبر، تعصّب اور ناانصافی کے خلاف قلم اٹھایا اور انسان کی عزت، وقار اور آزادی کے لیے آواز بلند کی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بڑی ادبی تحریکیں آزادیٔ انسان کے تصور سے جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اَدیب کا قلم صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ معاشرے کے ضمیر کی آواز بھی ہوتا ہے۔

آزادی کا مفہوم ہرگز بے لگام رویہ نہیں، بلکہ ذمہ داری، احترام اور قانون کی پاسداری کے ساتھ اپنے حقوق کا استعمال ہے۔ جس طرح ہر فرد کو اپنی رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے، اسی طرح دوسروں کے عقائد، تہذیب، ثقافت اور عزتِ نفس کا احترام بھی لازم ہے۔ حقیقی آزادی وہی ہے جو دوسروں کے حقوق کو پامال کیے بغیر انسان کو اپنی شخصیت کی تعمیر کا موقع فراہم کرے۔

آج کے ڈیجیٹل دور میں اظہار کے بے شمار ذرائع موجود ہیں، مگر ان کے ساتھ غلط معلومات، نفرت انگیزی اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ اظہار کے خطرات بھی بڑھ گئے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ آزادی کو شعور، اخلاق اور ذمہ داری کے ساتھ استعمال کیا جائے تاکہ معاشرہ اختلاف کے باوجود باہمی احترام اور رواداری کی فضا قائم رکھ سکے۔

اَدبی رسائل اور علمی جرائد کی ذمہ داری ہے کہ وہ آزاد، متوازن اور تعمیری فکر کی حوصلہ افزائی کریں۔ نئے قلم کاروں کو اظہار کے مواقع فراہم کریں، مکالمے کی روایت کو فروغ دیں اور ادب کو انسان دوستی، انصاف، امن اور بھائی چارے کا ترجمان بنائیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے ایک باشعور، مہذب اور ترقی پسند معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

آیئے! آزادی کو محض ایک نعرہ نہیں بلکہ ایک ذمہ دارانہ طرزِ حیات بنائیں؛ ایسی آزادی جو انسان کو انسان سے جوڑے، اختلاف کو احترام میں بدل دے اور ادب کو معاشرے کی مثبت تبدیلی کا مؤثر ذریعہ بنائے۔

اسی کائنات میں اے جگرؔ کوئی انقلاب اٹھے گا پھر
کہ بلند ہو کے بھی آدمی ابھی خواہشوں کا غلام ہے

مہتاب قدر
(جدّہ)

حمدِ ربِ کریم

اطہر عبّاسی

حمد کرتا ہوا بہ چشمِ نم
درِ اقدس پہ ہو گیا سرخم

ربِ کعبہ عطا ہو فضل و کرم
سرنگوں حمد کو ہوا ہے قلم

کر رہی ہے حیات دنیا کی
شکر مالک ترا ، قدم بہ قدم

تیرے محبوب ﷺ سے ملن کے لئے
اپنی باری کے منتظر ہیں ہم

لالہ و گل کو با وضو کرکے
مسکراتی چلی گئی شبنم

تیری رحمت کو دیکھ کر رحمٰن
دل ہے شرمندہ آنکھ ہے پُرنم

تیری آیات کی تلاوت سے
حرف مسرور ہورہے ہیں رنم

قلبِ اطہر کی ہو گئی تطہیر
بہہ گئے آنسوؤں میں سارے غم

نعت رسول مقبول ﷺ

محی الدین احمد (ابوالکلام آزاد)

موزوں کلام میں جو ثنائے نبی ﷺ ہوئی
تو ابتدا سے طبع رواں منتہیٰ ہوئی

ہر بیت میں جو وصفِ پیمبر رقم کیے
کاشانۂ سخن میں بڑی روشنی ہوئی

ظلمت رہی نہ پرتوِ حسنِ رسول ﷺ سے
بیکار اے فلک شبِ مہتاب بھی ہوئی

ساقی نے سلسبیل کے اوصاف جب پڑھے
محفل تمام مست مے بیخودی ہوئی

دل کھول کر رسول سے میں نے کیے سوال
ہرگز طلب میں عار نہ پیشِ سخی ہوئی

تاریک شب میں آپ ﷺ نے رکھا جہاں قدم
مہتابِ نقش پا سے وہاں روشنی ہوئی

ہے شاہِ دیں سے کوثر و تسنیم کا کلام
یہ آبرو تمام ہے حضرت کی دی ہوئی

سالک ہے جو کہ جادۂ عشقِ رسول ﷺ کا
جنت کی راہ اس کے لیے ہے کھلی ہوئی

آزاد اور فکر جگہ پائے گی کہاں
الفت ہے دل میں شاہِ زمن کی بھری ہوئی

نعت رسول مقبول ﷺ

مولانا محمد علی جوہر

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر لحظہ تشفی ہے ہر آن تسلی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے ہر روز یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

مجاہدین آزادی پر ڈاک ٹکٹ

کیا آج کا ہندوستان و میرے ہم وطن ان مجاہدین آزادی اور آزادی کی تحریکوں سے واقف ہیں؟

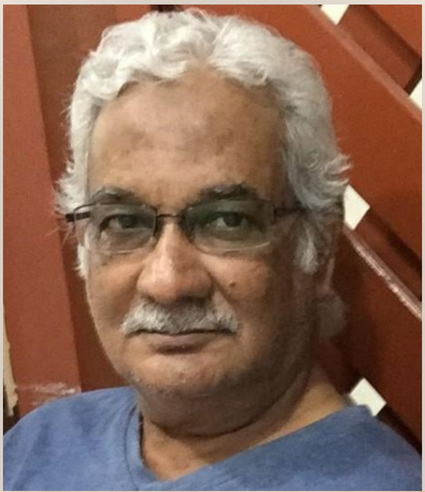

مرزا محمد نواب
(جدہ، سعودی عرب)

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندوستان کو آزادی ملی اور آج ۱۵ اگست ۲۰۲۶ کو ہم ہندوستانی اپنی آزادی کی ۸۰ ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔

جنگ آزادی تو شروع ہو چکی تھی ۱۸ ویں صدی میں۔ اس کی آبیاری کی گئی۔ محققین و تاریخ کے طلبا، بیج بونے والوں میں گنتی کے لوگوں کو جانتے ہیں لیکن لاکھوں آبیاری کرنے والوں میں بیشتر سے واقف نہیں۔ عام ہندوستانی اور اگر سچ کہوں تو آج تعلیمافتہ ہندوستانی طبقہ شاید ہی ان سے واقف ہو۔ انڈیا پوسٹ نے وقتاً فوقتاً چندہ و پیش پیش مجاہدین پر یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کئے اور اس طرح تحقیق کا دروازہ کھولا لاکھوں آبیاری کرنے والوں کے تعلق سے جاننے کا۔

آزادی کی جنگ میں بے شمار لوگوں نے حصہ لیا، صعوبتیں برداشت کیں، قربانیاں دیں، لیکن چھائے گنتی کے اور ہم ان گنتی کے لوگوں کو ہی یاد کرتے ہیں۔ یہ ڈاک ٹکٹس ان مجاہدوں کو گمنامی کے دھندلکوں میں گم نہیں ہونے دیں گے۔

آزادی کے بعد آزادی کے عنوان پر پہلا ڈاک ٹکٹ ۲۱ نومبر ۱۹۴۷ کو شائع ہوا تھا جس پر ہمارے قومی جھنڈے کی تصویر، تاریخ آزادی ۱۵ اگست اور جے ہند طبع تھے۔ اشوک کی لاٹ اور ہوائی جہاز دکھائے گئے دو ٹکٹ جن پر ہماری تاریخ آزادی ۱۵ اگست اور جے ہند طبع تھے بعد میں جاری ہوئے۔

آبیاری کرنے والے لاکھوں تھے۔ یہ ڈاک ٹکٹ ان دونوں یعنی بیج بونے والوں اور آبیاری کرنے والوں کے درمیان ربط کی وہ ناقابل فراموش تاریخ جسے جاننا مادر وطن کے ہر فرد کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ کسی جلاد سے کم نہیں اور اسے بھولنے والے کو نہیں بخشتی۔ میں نے میری ڈاک ٹکٹ البم سے ان جیالوں اور جیالیوں کا انتخاب سے انتخاب کیا تا کہ وطن عزیز کی جنگ آزادی کے مزید خاموش گوشے بھی آراستہ ہوں اور وطن کی آزادی کی آبیاری کرنے والوں پر تحقیق ہو۔

ہندوستان پر تین بیرونی طاقتیں مسلط تھیں۔

آزادی کی لڑائی صرف انگریزوں سے نہیں لڑی گئ۔ فرانسیسیوں سے بھی لڑی گئی اور پرتگالیوں سے بھی پیچھا چھڑا گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹٤۷ کو انگریز گئے، پانڈیچیری کو یکم نومبر ۱۹٥٤ کو تین سو سالہ فرانسیسی اقتدار سے آزاد کرنے والوں میں وی وینکٹا سبھا ریڈیار کا نام آتا ہے جس نے پانڈیچری کو ہندوستان میں ضم کرنے پر اصرار کیا تھا۔ ۱۹٦۱ میں گوا، دمن اور ڈیو کو ہندوستان میں ملا کر پرتگالی تسلط ان تین جگہوں پر ختم کیا گیا۔

آزادی کے گرویدہ شروع میں تین سوچوں میں بٹے ہوئے تھے۔ گاندھی جی کا عدم تشدد و عدم تعاون، بپھرے ہوئے نوجوانوں جیسے سبھاش چندر بوس، بھگت سنگھ، سورج نارائن کلا وغیرہ کا انقلابی قدم اور لال۔بال۔پال مثلث کی انتہا پسندی۔ اولذکر سوچ مقصد پانے میں کامیاب رہی۔

آزادی کے بیج بونے والے اور آبیاری کرنے والوں کے زمرے (categories) میں تھے:

شاہ و امراء جیسے بہادر شاہ ظفر، رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل وغیرہ؛ جج جیسے عباس طیب جی جو ۱۹۱۳ میں بڑودہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے؛ اعلیٰ سرکاری حکام و ملازمین، معلم و ماہرین تعلیم، مذہبی رہنما، صحافی، سماجی کارکن و مصلح، انقلابی ادھم سنگھ جس نے لندن میں جنرل ڈائر کو گولی مار کر ہلاک کیا تھا؛ بچھڑی ذات کے لوگ جیسے بابو جگجیون رام؛ فنکار، ادیب و شاعر، صنعت کار، آسودہ و مخیر حضرات، معمار؛

بیشتر کامیاب قانون داں وکالت پیشہ تھے اور کئی کا تعلق آج کے پاکستانی شہروں سے تھا۔ ان وکلاء میں دو تو ایسے تھے جنھوں نے انگریزوں کے خلاف مجاہدوں کی عدالتوں میں پیروی کی۔ بیرسٹر آصف علی نے ۱۸ اپریل ۱۹۲۹ کے دہلی میں مرکزی قانون ساز اسمبلی میں کئے گئے بم دھماکوں کے ایک ملزم بٹوکیشور دتا کی عدالت میں پیروی کی تھی۔ اس کیس کے دوسرے ملزم بھگت سنگھ تھے۔ دوسرے وکیل پنڈت مدن موہن مالویہ نے مشہور چوری چورا مقدمہ (Chauri Chaura Case) کے ملزموں کی الہ آباد ہائی کورٹ میں پیروی کی تھی۔ انہوں نے سیشن کورٹ کی طرف سے سزائے موت پانے والے تقریباً ۱۷۰ سے زائد ہندوستانی آزادی کے کارکنوں اور دیہاتیوں کا مقدمہ لڑا تھا اور ۱۵۰ سے زائد افراد کو پھانسی کے پھندے سے بچایا تھا؛

آزادی کی جدوجہد کے اولین محافظوں میں وہ بھی ہیں جنھوں انگریزوں کے خلاف پرچم بلند کیا اور لڑے۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ۱۸۰٦ میں ہندوستانی سپاہیوں کی پہلی بڑی اور پُرتشدد ویلور بغاوت تھی؛

ان میں آزادی کے وہ شیدائی بھی ہیں جن سے ان کے اپنوں نے دغابازی کی جیسے ٹیپو سلطان، رام چندر پانڈورنگ یبولیکر عرف تاتیا ٹوپے اور ایسے بھی ہیں جنھوں نے مل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جیسے دھیرن چنا ملائی کا اتحاد ٹیپو سلطان کے ساتھ؛

وہ دیوانے بھی تھے جن کا کورٹ مارشل ہوا جیسے منگل پانڈے اور ناگالینڈ کی خاتون مجاہد آزادی رانی گائدنلیو جس نے پندرہ سال مستقل جیل میں بتائے اور اسے رہائی آزادی کے بعد ملی؛

ان میں ایک ہی خاندان ایسے افراد بھی تھے جن میں ایک کو بے پناہ مقبولیت ملی اور دوسرا کم و بیش گمنامی میں کھو گیا، جیسے وٹھل بھائی پٹیل جو ولبھ بھائی پٹیل کے بڑے بھائی تھے، کملا نہرو جو پنڈت جواہر لال نہرو کی شریک حیات تھیں، شریمتی رامیشوری نہرو؛

ان جیالوں میں وہ بھی تھے جنھوں نے اپنے قلم سے آزادی کی جدوجہد میں ایک لازوال روح پھونکی۔ ان کی نثر و نظم حب الوطنی سے لبریز تھی اور جلسوں میں ان کی گائیکی تمام کو سرشار کر دیتی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، منشی پریم چند، علامہ اقبال کا "سارے جہاں سے اچھا ھندوستاں ہمارا" شیولال پرساد کا "جھنڈا اونچا رہے ہمارا"، کوٹمارا جو راما راؤ جیسے مجاہد و صحافی جنھیں

مجاہدین آزادی پر ڈاک ٹکٹس

۱۳۸۔رانی گائدنلیو

نیتاجی سبھاش چندر بوس

۱۴۵۔ شاہنواز خان

۱۴۹۔کوٹمارا جوراماراؤ

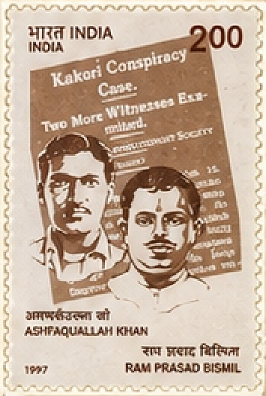

۱۵۲۔اشفاق اللہ خان

۱۶۴۔ سرداراجیت سنگھ

۱۷۲۔پی ککن

۱۷۳۔بساون سنہا

۱۷۶۔وجے لکشمی پنڈت

۱۷۷۔ڈاکٹر شنکر دیال شرما

۲۰۸۔سبھدرا جوشی

گوا کی آزادی

۲۱۲۔مدن موہن مالویہ

۵۔لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک

۱۸۰۶ کی ویلور بغاوت

۱۸۸۔نوپی لال جدوجہد

۲۰۰۔پنگالی وینکایا

وی وینکٹا سبا ریڈیار

شاہنواز خان، جی پی ایس ڈھلون، پی کے سہگل

۷۔بپن چندر پال

نیشنل ہیرالڈ میں ۱۹٤۲ میں اداریہ ''جیل یا جنگل'' لکھنے پر جیل ہوئی تھی، بنکم چندر چٹر جی، شاعرہ سبدھرا کماری چوہان، فقیر موہن سیناپتی، نانک سنگھ جنھیں جلیانوالہ باغ قتل عام پر لکھی طویل نظم پر جیل ہوئی تھی اور کتاب Blood-stained Baisakhi پر پابندی لگی تھی؛

وہ بھی تھے جنھوں نے حب الوطنی سے بھرے نغموں کی دُھنیں بنائیں اور انھیں مقبول کیا جیسے خودی رام بوس اور بنکم چندر چٹر جی؛

ان میں وہ بھی تھے، بالخصوص جنوبی ہند والے جنھیں ہم پورے ناموں سے نہیں جانتے جیسے تانگوتوری پراکاسم؛

اور وہ ہندوستانی بھی تھے جنھوں نے بیرون ہندرہ کر انقلابی تنظیمیں بنائیں، ملک ملک گھوم کر آزادئی ھند کا پرچار کیا، جیسے راجا مہندرا پرتاپ، شیام جی کرشنا ورما، اجیت سنگھ؛

ان میں وہ بھی تھے جو ہندوستانی نہیں تھے لیکن ان کی رفاہی کوششوں سے ہندوستانی متاثر ہوکر آزادی کی جنگ کا حصہ بنے جیسے اینی بیسنت، میڈلن سلیڈ (Medalin Slaide) عرف میرا بہن؛

اور وہ بھی جنھوں ہندوستانی کی آزادی میں ھند و بیرون ھند جدوجہد کی، جیسے ایلن اوکٹاوین ہیوم (اے او ہیوم)، نیلی گرے جن کی شادی جتندرا موہن سین گپتا سے ہوئی تھی؛

اور ایک وہ بھی جو ہندوستانی نژاد پاکستانی ہونے کے باوجود حکومت ہند کے سب سے بڑے شہری اعزاز بھارت رتن سے نوازہ گیا جیسے خان عبدالغفار خان؛

ان میں وہ بھی تھے جنھوں خفیہ تحریکیں چلائیں جیسے ریشمی رومال تحریک (Silk Letter Movement یا Silk Handkerchief Movement) جس کا مقصد برطانوی حکومت کے خلاف عسکری اتحاد بنانا تھا۔

دیگر تحریکوں میں ایک نوپی لال تحریک بھی ہے جو منی پور کی تاریخ کا ایک ذریں باب ہے جس میں منی پور کی خواتین نے انگریزوں کے مظالم کے خلاف ۳۹۔۱۹٤۰ تک جدوجہد کی۔

علاوہ ۱۹۱۹ء کی تحریک خلافت، ۱۹۲۰ء کی تحریک عدم تعاون تحریک برطانوی اشیا کا بائیکاٹ کیا گیا، ۱۹۲۵ کی کاکوری سازش یا کاکوری ٹرین ڈکیتی، ۱۹۳۰ کی سول نافرمانی تحریک جو نمک قانون کے خلاف ورزی اور ڈانڈی مارچ کے نام سے مشہور ہوئ اور ۱۹٤۲ کی ہندوستان چھوڑو تحریک۔

ان مجاہدوں میں وہ بھی تھے جو چھپ کر خفیہ طور انگریزی قانون یا حکومت کے خلاف ھند و بیرون ھند سرگرم رہے جیسے بساون سنہا وغیرہ؛

ان ہی سرفروشوں میں وہ بھی تھے جنھیں ہندوستان نے صدر مملکت کے جلیلہ مرتبے پر فائز کیا، جیسے ڈاکٹر ذاکر حسین، فخرالدین علی احمد، گیانی ذیل سنگھ، اور ڈاکٹر شنکر دیال شرما جو معروف بطور دین دیال شرما تھے اور ان سے عمان کے سلطان کا تاریخی اور جذباتی واقعہ جڑا ہوا ہے۔

۱۹۹٤ میں جب صدر ڈاکٹر شرما صاحب نے مسقط کا سرکاری دورہ کیا تھا تو عمان کے سلطان قابوس بن سعید نے تمام سفارتی پروٹوکول بالائے طاق رکھ کر خود ہوائی جہاز پر جا کر ان کا استقبال کیا اور خود گاڑی ڈرائیو کر انہیں اپنے محل لے گئے۔ دریافت کرنے پر سلطان قابوس نے وضاحت کی تھی کہ وہ صرف بھارتی صدر کا نہیں بلکہ اپنے محترم استاد کا احترام کر رہے تھے، کیونکہ جب وہ پونے میں زیرِ تعلیم تھے تو ڈاکٹر شرما ان کے پروفیسر تھے۔

آزادی کے یہ متوالے صرف مجاہد آزادی ہی نہیں تھے۔ وہ سماج و معاشرے کی اصلاح کرنے والے بھی تھے۔ انھوں نے سماج و معاشرے میں پھیلے غلط طور طریقے اور رسموں جیسے ہریجنوں کی مندر میں داخلے پر پابندی کے خلاف مہم چلائی۔ پی ککن، پوٹی سریرامولوان میں ہیں:

تعلیم نسواں و حقوق نسواں پر بھی جگ لال چودھری، وجے لکشمی پنڈت جیسے لوگوں نے بےلوث کام کیا؛

آزادی کے جانبازوں کو جیلوں میں ٹھونسا گیا تو ان میں بیشتر نے قید میں تصنیف پر توجہ دی، جیسے جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، کرشنا تھ سرما وغیرہ۔

برسوں پہلے میرے ایک صحافی ساتھی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ ابوالکلام آزاد کون ہیں؟ کیا آج کا ہندوستان و میرے ہم وطن کئی زمروں (categories) میں بٹے مجاہدین آزادی اور آزادی کی تحریکوں سے واقف ہیں؟ یہ ایک پریشان کن سوال ہے۔

۸۷۔ویرنارائن سنگھ

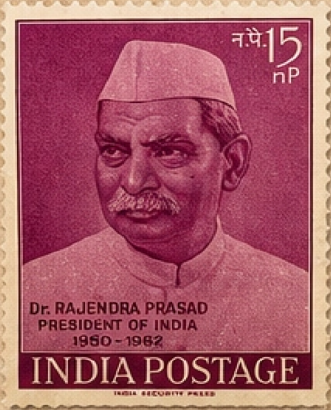

۱۳۔ڈاکٹر راجندر پرشاد

۲۰۔لالہ لجپت رائے

۳۰۔بنکم چندر چٹرجی

۳۷۔ایلن اوکتاوین ہیوم (اے او ہیوم)

۴۱۔ٹیپو سلطان

۴۲۔کملا نہرو

۱۴۔اینی بے سنٹ

۶۳۔ میرا بہن (میڈالن سلیڈ Medalin Slaide)

۷۱۔رام چندر پانڈورنگ ییولیکر عرف تاتیا ٹوپے

۷۲۔منگل پانڈے

۷۳۔بیگم حضرت محل (بیگم آف اودھ)

۸۳۔حکیم اجمل خان

۹۷۔آصف علی

۱۰۶۔خودی رام بوس

بال گنگادھر تلک

رام چند

अब्बास तय्यबजी Abbas Tayyabji

अब्दास तल्यवजी का जन्म 1–फरवरी सन 1853 को बरौड़ा में हुआ। दस वर्ष की आयु में हो शिला हासित ह्र्वो 1872 में मैंट्रिक में अव्वल स्थान प्राप्त किया और प्रथम भारतीय बैरिस्टर बने। 1879 में उन्होंने बड़ौदा राज्य सेवा में कारभार संभालाा और 1913 न्यायालय के न्यायाधीश के पदसे सेवानिवृत हुए। वह भारतीय राष्ट्रीय कांग्रेस की स्यापना से 1885 से ही उसके सदस्य ये। जालियांवला बाग-नरसंहार के प्रेक्षम जॉंल विाल सरकार से माता तोड किया। अपने विदेशी समंपर्कीं के प्रति भी वह सचेत ये और स्वराज्य के प्रति सदा से आशावान। असहयोग आन्दोनन से जुड़े गये। 1919 में जलियांवाला बाग गोलीकांड की गाॅंच मायेट्री

1930 में उहोंने डंडी मार्च की शानदोर संपाली। पूरे देश के लोग उन के लिए यह गहरा नारो के 'खरा रूपैया गॉंधी का, खरारूपैया नेहूस का' जिवने, 9 सुवय 1936 को अवास ने 'खवांस्न फ्न्हीनि वांदा की शीलायद गहरा उनकी वेटी ने उनकी 'वा केस्मारक 'वह 'साउय वुडछे खूट, मुसूरी' ल्यि 1951 में भारत के में भारत के राष्ट्रपति को समर्पित कर कर दिया।

Abbas Tayyabji was born in Baroda on 1st Feb. 1853. At the age of 10 he went to London where he topped in matriculation in 1872 & was the first Indian to become a Barrister. He joined Baroda state service in 1879 and retired as Chief Justice of Baroda High Court in 1913. He was a member of the Indian National Congress since its inception in 1885. After Jallianwala Bagh massacre he broke with the British & condemned the foreign rule in India. He burnt his foreign clothes and put his heart and soul into the non-cooperation movement. Mahatma Gandhi nominated him to the Congress inquiry committee probing the Jalianwala Bagh tragedy in 1919.

He was second-in-command of the Dandi March in 1930 and the people resounded the slogan "Khara Rupayya Chandi ka, Raj Tayyab Gandhi ka" all over the Country. Abbas Tayyabji breathed his last on June 9, 1936 & his daughter dedicated his house "Southwood Estate Mussoorie" to The President of India in his memory for social cause in the year 1951.

विशेष आवरण Special Cover 8 June 2013

अब्बास तय्यबजी Abbas Tayyabji

(1853 -1936)

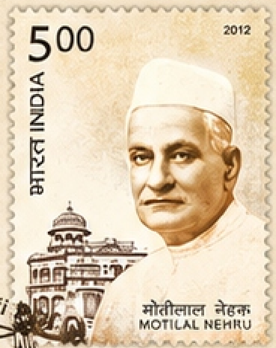

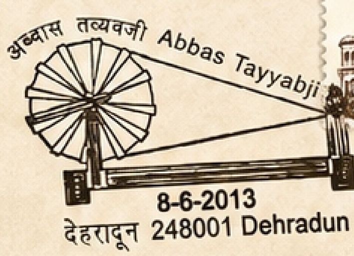

تحریک آزادی میں ۱۹۳۰ کی ۲۴ روزہ ڈانڈی مارچ پر جاری کیا گیا اسپیشل لفافہ۔

اس لفافے پر یہ سلوگن ''کھرا روپیہ چاندی کا، راج طیب گاندھی کا'' بے حد مقبول ہوا تھا۔

اے زمینِ وطن

شجاع الدین شاہد (ممبئی)

میرا پیارا وطن، یہ ہے میرا وطن
تجھ کو کہتے ہیں سب، خوشبوؤں کا چمن

لہلہاتی یہ فصلیں، یہ شادابیاں
ناز کرتی ہیں تجھ پہ حسیں وادیاں
تیری مٹی میں کتنی ہیں زرخیزیاں

اے زمین وطن، اے زمین وطن
اے زمین وطن، اے زمین وطن

دے دیا ہے شہیدوں نے تجھ کو لہو
مر مٹے بسمل، اشفاق، پانڈے گرو
جان دے کر رکھی ہے تری آبرو

کوکھ سے تیری پیدا ہوئے یہ رتن
اے زمین وطن، اے زمین وطن

آنچ آنے نہ دینگے کبھی تجھ پہ ہم
اپنی ہمت نہیں ہے کسی سے بھی کم
نام لے کر تری لے رہے ہیں قسم

تیری خاطر لٹادینگے ہم جان وتن
اے زمین وطن، اے زمین وطن

نیا سویرا

احمد شاذ قادری

سیاہ شب کا غرور ٹوٹا
نیا سویرا خوشی کا آیا
چمن چمن میں صبا نے جا کر
پیام امن و اماں سنایا

جلائے ہیں جب چراغ خوں سے
اُجالے تب زندگی میں آئے
وہ حوصلہ تھا بشر بشر میں
کہ جس سے طوفاں بھی کانپ جائے

ہمیں کو اب گلستان نو کو
سنبھالنا ہے، اجالنا ہے
عدو کے شر سے بچا کے اس کو
سنوارنا ہے، نکھارنا ہے

وطن کو تقسیم کرنے کی اب
کوئی بھی سازش پنپ نہ پائے
نہ کوئی نفرت کے بیج بوئے
نہ کوئی کمزور کو ستائے

محبتوں کے سفیر ہیں ہم
ملانا دل کو ہمارا مقصد
بھلا کے ساری پرانی رنجش
عداوتوں کو مٹانا مقصد

امر شہیدوں کا خون ہردم
وطن کی رگ رگ میں دوڑتا ہے
ہمارا پرچم بلندیوں پر
فلک کے ماتھے کو چومتا ہے

وقار اس کا عظیم تر ہو
ذرا بھی اس کی نہ شان جائے
یہ آرزو ہے ہمارے دل کی
وطن کی خاطر یہ جان جائے

غزلیں

آبِص باغی (ملائشیا)

چیخا ، نہ بول پایا دہائی نہ دے سکا
نردوش تھا مگر میں صفائی نہ دے سکا

پاؤں میں بیڑیاں لیے مقتل کو چل دیا
عینی گواہ تھا پہ گواہی نہ دے سکا

ہائے اُدھار مانگ کے لایا تھا چوڑیاں
اُس کو میں منہ دکھائی میں رائی نہ دے سکا

کھڑکی کی اوٹ میں وہ ستارہ تھا یا کہ چاند
روشن تھا اس قدر کہ دکھائی نہ دے سکا

کوشش تو کر رہا تھا رفو کی شگاف پر
بُنکار پہلے جیسی بُنائی نہ دے سکا

غربت تھی اس قدر کہ فقط رو رہا تھا وہ
بیمار باپ کو جو دوائی نہ دے سکا

پردیس میں گزار دی آبصؔ تمام عمر
حق داروں کو حقوق کی پائی نہ دے سکا

خالد ہاشمی

لالہ وگل کے داغ بھر بھی نہیں
اپنی شہرت تو باغ بھر بھی نہیں

نام ہے آفتاب بھر ان کا
اور اُجالا چراغ بھر بھی نہیں

خود کو شاہین وہ سمجھتے ہیں
حیثیت جن کی زاغ بھر بھی نہیں

دل تو ہوتا بڑا دماغ سے ہے
ان کا دل تو دماغ بھر بھی نہیں

ظرفِ میخوار پر ہو طے مقدار
یوں ہی ساقی! ایاغ بھر بھی نہیں

کیوں نہ خود میں اسے تلاش کروں
کیا میں اس کا سراغ بھر بھی نہیں

نذیر راہی (کولکاتا)

جینے کو یوں تو جیتے ہیں ناداں ترے بغیر
پر زندگی ادھوری ہے جاناں ترے بغیر

میں منتظر ہوں ساتھ میں تو ہمسفر رہے
باندھوں گا میں سفر کا نہ ساماں ترے بغیر

جینے کا ہم نشیں کوئی رستہ نکال دے
کب تک رہوں میں ایسے پریشاں ترے بغیر

یوں تو مجھے بھروسہ دل بادباں پہ تھا
لیکن یہ تھم نہ پائے گا طوفاں ترے بغیر

کالی گھٹا بھی آئی تو آ کر چلی گئی
پھیکا لگا یہ موسم باراں ترے بغیر

تاریکیو ں میں خرمن جاں کی خبر تو لے
کیسے کروں میں اس میں چراغاں ترے بغیر

مضطر ہے دل تو اور پریشاں دماغ ہے
راہی کا ہو نہ پائے گا در ما ں ترے بغیر

ریشمی رومال تحریک

برصغیر کی آزادی کی ایک خفیہ انقلابی جدوجہد

تعارف

برصغیر کی تحریکِ آزادی کی تاریخ متعدد سیاسی، مذہبی اور انقلابی تحریکوں سے عبارت ہے۔ انہی میں ایک اہم اور منفرد تحریک ریشمی رومال تحریک ہے، جس نے برطانوی استعمار کے خلاف خفیہ اور منظم جدوجہد کی ایک نئی مثال قائم کی۔ اس تحریک کی قیادت شیخ الہند مولانا محمود حسن نے کی، جبکہ ان کے رفقا میں مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر علماء شامل تھے۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد ہندوستان کو برطانوی اقتدار سے آزاد کرانا اور ایک آزاد قومی حکومت کا قیام تھا۔

اس تحریک کو "ریشمی رومال تحریک" اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے خفیہ پیغامات ریشم کے باریک کپڑے پر لکھ کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچائے جاتے تھے تاکہ انگریز حکومت کو ان کی خبر نہ ہو۔

تاریخی پس منظر

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد برطانوی حکومت نے ہندوستان پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی۔ تاہم آزادی کی خواہش ختم نہ ہوئی۔ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں مختلف مذہبی، سیاسی اور قومی تحریکیں وجود میں آئیں۔ انہی حالات میں دارالعلوم دیوبند کے علماء نے آزادی کو اپنی دینی اور قومی ذمہ داری سمجھتے ہوئے ایک خفیہ انقلابی منصوبہ تیار کیا۔

پہلی جنگِ عظیم (1914ء۔1918ء) نے اس تحریک کو مزید تقویت دی، کیونکہ برطانیہ جنگ میں مصروف تھا اور انقلابی رہنماؤں نے اسے آزادی کے لیے

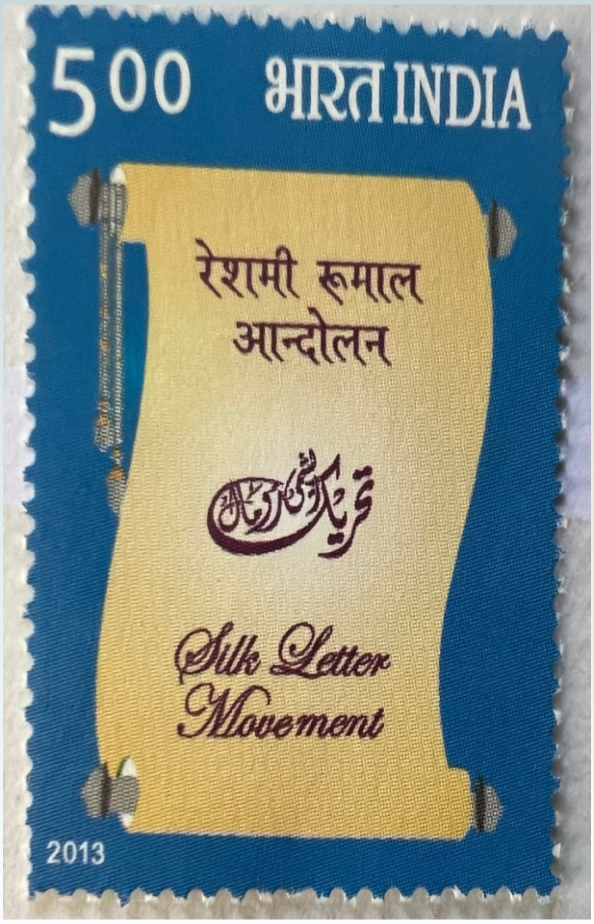

موزوں موقع سمجھا۔

تحریک کے بانی اور قائدین

ریشمی رومال تحریک کے روحِ رواں مولانا محمود حسن تھے، جنہیں "شیخ الہند" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان بھیجا تا کہ وہاں ایک آزاد ہندوستانی حکومت کے قیام اور بیرونی تعاون کے امکانات پیدا کیے جا سکیں۔

دیگر اہم شخصیات میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد میاں منصور انصاری اور کئی دیگر علماء و مجاہدین شامل تھے، جنہوں نے تحریک کو کامیاب بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

تحریک کے مقاصد

ریشمی رومال تحریک کے بنیادی مقاصد درج ذیل تھے:

☆ ہندوستان کو برطانوی استعمار سے آزاد کرانا۔

☆ بیرونی اسلامی ممالک خصوصاً افغانستان، ترکی اور جرمنی کی حمایت حاصل کرنا۔

☆ مسلح جدوجہد کے ذریعے انگریزی حکومت کا خاتمہ کرنا۔

☆ ایک آزاد اور خودمختار ہندوستانی حکومت کا قیام عمل میں لانا۔

☆ ہندوستان کے مختلف انقلابی گروہوں کو متحد کرنا۔

ریشمی خطوط کی اہمیت

اس تحریک کی سب سے نمایاں خصوصیت ریشم کے کپڑے پر لکھے گئے خفیہ خطوط تھے۔ ان خطوط میں انقلابی منصوبے، رابطے اور حکمتِ عملی درج ہوتی تھی۔ ریشم کا کپڑا ہلکا، باریک اور آسانی سے چھپایا جا سکتا تھا، اس لیے اسے پیغام رسانی کے لیے استعمال کیا گیا۔

تحریک کی ناکامی کے اسباب

1916ء میں یہ خفیہ منصوبہ برطانوی حکومت کے علم میں آ گیا۔ متعدد خطوط پکڑے گئے، جن کے نتیجے میں تحریک کے کئی اہم رہنما گرفتار ہوئے۔ مولانا محمود حسن کو گرفتار کر کے مالٹا کی جیل بھیج دیا گیا، جبکہ دیگر کارکن بھی مختلف سزاؤں کا شکار ہوئے۔

ناکامی کی وجوہات میں خفیہ معلومات کا افشا، وسائل کی کمی، بیرونی تعاون کا مکمل طور پر حاصل نہ ہو سکنا اور برطانوی خفیہ اداروں کی سخت نگرانی شامل تھیں۔

تحریک کے اثرات

اگرچہ یہ تحریک اپنے فوری مقاصد حاصل نہ کر سکی، لیکن اس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

☆ آزادی کی جدوجہد میں نئی روح پیدا ہوئی۔

☆ علماء کے سیاسی کردار کو نمایاں حیثیت ملی۔

☆ نوجوانوں میں آزادی کا جذبہ مضبوط ہوا۔

☆ بعد کی قومی تحریکوں کے لیے فکری اور عملی بنیاد فراہم ہوئی۔

☆ ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ قومی جدوجہد کے تصور کو تقویت ملی۔

تاریخی اہمیت

ریشمی رومال تحریک ہندوستان کی پہلی منظم خفیہ انقلابی تحریکوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس نے یہ ثابت کیا کہ آزادی کے حصول کے لیے صرف سیاسی مذاکرات ہی نہیں بلکہ منظم منصوبہ بندی، قربانی اور قومی اتحاد بھی ضروری ہیں۔ تحریک کے رہنماؤں کی استقامت، دینی بصیرت اور حب الوطنی آج بھی تاریخ کا روشن باب ہیں۔

نتیجہ

ریشمی رومال تحریک برصغیر کی تحریکِ آزادی کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اگرچہ یہ اپنے فوری مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکی، لیکن اس نے آزادی کے سفر کو نئی سمت دی اور آنے والی نسلوں کے لیے ایثار، استقلال اور قومی شعور کی مثال قائم کی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے رفقا کی خدمات ہمیشہ تحریکِ آزادی کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائیں گی۔

گاندھی، نہرو، مولانا آزاد اور پٹیل

جدوجہدِ آزادیِ ہند کی چار مختلف مگر باہم مربوط جہتوں کے نمائندے

تمہید

برصغیر کی آزادی کی تاریخ ایک طویل، پیچیدہ اور کثیرالجہتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے خلاف مزاحمت کا آغاز مختلف ادوار میں مختلف شکلوں میں ہوا، لیکن بیسویں صدی میں یہ جدوجہد ایک وسیع عوامی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔ اس تحریک میں سیاسی رہنماؤں، علماء، دانش وروں، صحافیوں، طلبہ، مزدوروں، کسانوں اور خواتین نے اپنے اپنے انداز میں حصہ لیا۔ ان رہنماؤں میں مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

یہ چاروں شخصیات ایک ہی سیاسی جماعت، یعنی ہندوستانی قومی کانگریس، سے وابستہ ہونے کے باوجود مزاج، سیاسی فکر اور جدوجہد کے طریقۂ کار میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ گاندھی نے عدم تشدد اور ستیہ گرہ کو سیاسی ہتھیار بنایا، نہرو نے جدید قوم پرستی، جمہوریت اور سماجی انصاف کی وکالت کی، مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ ہندوستان کے تصور کو اپنی سیاسی جدوجہد کا مرکز بنایا، جبکہ پٹیل نے تنظیمی قوت، عوامی تحریک اور عملی سیاسی حکمتِ عملی کے ذریعے آزادی کی جدوجہد کو مضبوط کیا۔

مہاتما گاندھی: عدم تشدد کو سیاسی طاقت بنانے والا رہنما

موہن داس کرم چند گاندھی 1915ء میں جنوبی افریقہ سے ہندوستان واپس آئے۔ جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ کے تجربے نے ان کی سیاسی فکر کو گہرا اثر دیا تھا۔ ہندوستان واپسی کے بعد انہوں نے کسانوں، مزدوروں اور عام لوگوں کے مسائل کو قومی سیاست سے جوڑنے کی کوشش کی۔

گاندھی جی کی سب سے بڑی سیاسی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے آزادی کی تحریک کو محض تعلیم یافتہ طبقے یا سیاسی کارکنوں تک محدود نہیں رہنے دیا بلکہ اسے عوامی تحریک میں تبدیل کیا۔ عدم تعاون تحریک 1920ء، سول نافرمانی تحریک 1930ء اور ہندوستان چھوڑو تحریک 1942ء ان کی قیادت میں چلنے والی اہم تحریکیں تھیں۔ سرکاری تاریخی ریکارڈ بھی ان تینوں

تحریکوں کو ہندوستانی آزادی کی جدوجہد میں فیصلہ کن اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں۔

1920ء کی عدم تعاون تحریک میں غیر ملکی اشیا کے بائیکاٹ، سرکاری اداروں سے عدم تعاون اور کھادی کے فروغ کو اہمیت دی گئی۔ گاندھی جی کا اصرار تھا کہ برطانوی حکومت کے خلاف مزاحمت پرامن اور عدم تشدد پر مبنی ہونی چاہیے۔ چوری چورا کے واقعے میں تشدد کے بعد انہوں نے عدم تعاون تحریک واپس لے لی، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مقصد کے ساتھ ساتھ جدوجہد کا اخلاقی طریقہ بھی بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔

1930ء میں نمک کے قانون کے خلاف ڈانڈی مارچ نے گاندھی جی کی تحریک کو عالمی توجہ دلائی۔ نمک جیسی روزمرہ ضرورت کو آزادی کی علامت بنا دینا ان کی سیاسی بصیرت کی مثال تھا۔ 1931ء میں گاندھی جی اور لارڈ اروِن کے درمیان مذاکرات کے نتیجے میں گاندھی-اروِن معاہدہ بھی ہوا۔

1942ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک نے آزادی کی جدوجہد کو فیصلہ کن مرحلے میں پہنچا دیا۔ گاندھی کا نعرہ "کرو یا مرو" عوامی جذبے کی علامت بن گیا۔ اگرچہ برطانوی حکومت نے تحریک کو سختی سے دبایا، لیکن اس تحریک نے یہ واضح کر دیا کہ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو زیادہ دیر برقرار رکھنا آسان نہیں تھا۔

جواہر لعل نہرو: جدید ہندوستان کا تصور

جواہر لعل نہرو ہندوستانی آزادی کی تحریک کے ان رہنماؤں میں شامل تھے جنہوں نے قومی آزادی کو جدید سیاسی، معاشی اور سماجی تصورات سے جوڑا۔ وہ 1889ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے اور انگلستان سے تعلیم حاصل کر کے ہندوستان واپس آئے۔ 1912ء کے بعد ان کی سیاسی سرگرمیوں میں بتدریج اضافہ ہوا اور 1916ء میں لکھنؤ کانگریس کے اجلاس میں ان کی گاندھی جی سے ملاقات ہوئی، جس نے ان کی سیاسی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

نہرو نے عدم تعاون تحریک میں فعال کردار ادا کیا اور 1921ء میں گرفتار ہوئے۔ انہوں نے کسانوں اور غریب طبقوں کے مسائل کو بھی اپنی سیاست کا حصہ بنایا۔ 1930ء کی سول نافرمانی تحریک میں انہوں نے اتر پردیش میں ٹیکس نہ دینے کی مہم کی قیادت کی اور قید ہوئے۔ سرکاری نہرو پورٹل کے مطابق 1920ء سے 1945ء کے دوران انہوں نے مجموعی طور پر تقریباً نو سال جیل میں گزارے۔

نہرو کی سیاسی زندگی کا ایک اہم موڑ 1929ء کا لاہور اجلاسِ کانگریس تھا، جس کی صدارت انہوں نے کی۔ اسی اجلاس میں مکمل آزادی، یعنی پورن سوراج، کو کانگریس کے سیاسی مقصد کے طور پر نمایاں کیا گیا۔ 1942ء میں انہوں نے ہندوستان چھوڑو قرارداد کی حمایت کی اور 9 اگست کو گرفتار ہوئے۔

نہرو کی فکر میں آزادی صرف برطانوی اقتدار کے خاتمے کا نام نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے ہندوستان کا تصور رکھتے تھے جو جمہوری، جدید، سائنسی مزاج کا حامل اور معاشی و سماجی انصاف پر قائم ہو۔ ان کی خودنوشت An Nehru:Autobiography بھی محض شخصی زندگی کی داستان نہیں بلکہ ہندوستان کی سیاسی بیداری اور آزادی کی جدوجہد کی ایک اہم دستاویز سمجھی جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد: اتحادِ ہند کے علم بردار

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم عالم، صحافی، مفکر اور سیاسی رہنما تھے۔ ان کی سیاسی زندگی میں صحافت کا بھی غیر معمولی کردار تھا۔ انہوں نے اردو اخبار الہلال کے ذریعے سیاسی بیداری پیدا کی، جسے برطانوی حکومت نے بالآخر پابندی کا نشانہ بنایا۔

مولانا آزاد کا بنیادی سیاسی تصور یہ تھا کہ ہندوستان کے مختلف مذہبی اور ثقافتی طبقات مل کر ایک مشترکہ ہندوستانی قوم تشکیل دے سکتے ہیں۔ وہ تقسیمِ ہند کے مخالف اور متحدہ ہندوستان کے زبردست حامی تھے۔ ان کی سیاست میں قومی آزادی کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔

1920ء کے عشرے میں وہ خلافت تحریک سے بھی وابستہ ہوئے۔ ہندوستانی قومی کانگریس نے بھی خلافت کے مطالبے کی حمایت کی اور گاندھی جی کی قیادت میں عدم تعاون کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس مرحلے پر مولانا آزاد نے قومی تحریک اور مسلم سیاسی بیداری کے درمیان ایک اہم رابطے کا کردار ادا کیا۔

مولانا آزاد 1923ء اور پھر 1940ء میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ خاص طور پر 1940ء سے 1946ء تک کا دور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا نہایت اہم زمانہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم، ہندوستان چھوڑو تحریک، کرپس مشن، شملہ کانفرنس اور آزادی کے مذاکرات کے دوران مولانا آزاد کانگریس کی قیادت میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔

ان کی شخصیت کا امتیاز یہ تھا کہ وہ مذہبی علم، جدید سیاسی شعور، صحافت اور قومی سیاست؛ چاروں میدانوں کو یکجا کرتے تھے۔ آزادی کی تاریخ میں مولانا آزاد کی سب سے بڑی خدمات

میں سے ایک ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ ہندوستانی قومیت کی وکالت ہے۔

سردار ولبھ بھائی پٹیل: تنظیمی قوت اور عوامی مزاحمت

ولبھ بھائی پٹیل گاندھی جی کے قریبی ساتھی اور کانگریس کے مضبوط ترین تنظیمی رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق گجرات سے تھا اور انہوں نے کسانوں کی تحریکوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔

کھیڑا اور بارڈولی کی کسان تحریکیں ان کی سیاسی زندگی کے اہم سنگِ میل ہیں۔ گجرات کے کسانوں نے ظالمانہ اور غیر منصفانہ محصولات کے خلاف مزاحمت کی اور پٹیل نے ان کی قیادت میں اہم کردار ادا کیا۔ سرکاری تاریخی مواد میں بارڈولی اور کھیڑا کے کسانوں کی جدوجہد کو پٹیل کی قیادت سے نمایاں طور پر جوڑا گیا ہے۔

بارڈولی کی کامیاب تحریک کے بعد انہیں ”سردار“ کا لقب ملا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت تنظیم سازی، انتظامی صلاحیت اور عملی سیاسی حکمتِ عملی تھی۔ وہ عملی اعتبار سے گاندھی جی کے عدم تشدد کے اصولوں سے وابستہ رہے۔

آزادی کی آخری جدوجہد میں پٹیل نے کانگریس کی تنظیم کو مضبوط رکھنے اور عوامی تحریک کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آزادی کے بعد ہندوستانی ریاستوں کے انضمام میں بھی ان کی تاریخی خدمات ہیں، تاہم یہ ان کے آزادی سے پہلے کے کردار سے الگ ایک بعد از آزادی مرحلہ تھا۔

چاروں رہنماؤں کا باہمی تعلق

گاندھی، نہرو، آزاد اور پٹیل کے سیاسی تعلقات محض یکساں خیالات رکھنے والے رہنماؤں کا تعلق نہیں تھا۔ ان کے درمیان بعض اہم سیاسی معاملات پر اختلافات بھی موجود تھے، لیکن آزادی کی جدوجہد نے انہیں ایک وسیع تر قومی مقصد کے لیے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا۔

گاندھی جی بنیادی طور پر اخلاقی سیاست، عدم تشدد اور عوامی ستیہ گرہ کے علم بردار تھے۔

نہرو جدید قوم پرستی، جمہوریت، سائنسی فکر اور معاشی منصوبہ بندی کے حامی تھے۔

مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ قومیت اور متحدہ ہندوستان کے تصور کو اپنی سیاسی جدوجہد کا مرکز بنایا۔

پٹیل تنظیم، عملی سیاست، عوامی تحریک اور انتظامی صلاحیت کے لیے معروف ہوئے۔

یوں دیکھا جائے تو یہ چاروں شخصیات آزادی کی تحریک کی چار مختلف مگر باہم مربوط جہتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

آزادی کی جدوجہد میں عوام کا کردار

یہ بات بھی تاریخی طور پر اہم ہے کہ ہندوستان کی آزادی صرف چند بڑے رہنماؤں کی جدوجہد کا نتیجہ نہیں تھی۔ لاکھوں عام ہندوستانیوں نے جیلیں کاٹیں، جرمانے برداشت کیے، سرکاری ملازمتیں چھوڑیں، غیر ملکی کپڑوں کا بائیکاٹ کیا اور مختلف تحریکوں میں حصہ لیا۔

گاندھی جی، نہرو، آزاد اور پٹیل جیسے رہنماؤں کی اصل کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے عوامی جذبات کو ایک منظم سیاسی تحریک میں تبدیل کرنے میں مدد دی۔ کسان، مزدور، طلبہ، خواتین، صحافی، علماء اور ادیب سب نے اس تحریک میں مختلف سطحوں پر حصہ لیا۔ اس لیے

ہندوستان کی آزادی کو صرف ”چند رہنماؤں“ کی کامیابی کہنا تاریخ کے وسیع تر عوامی کردار کو نظرانداز کرنا ہوگا۔

اختلافات اور تاریخی پیچیدگیاں

تحریکِ آزادی کی تاریخ کو غیر جانب دارانہ انداز میں سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان رہنماؤں کے درمیان موجود اختلافات کو نظرانداز نہ کیا جائے۔ نہرو اور پٹیل کے درمیان بعض سیاسی اور معاشی معاملات پر اختلافات تھے۔ گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کے درمیان بھی تحریک کے طریقۂ کار پر اختلافات پیدا ہوئے۔ مولانا آزاد کی متحدہ ہندوستان کی حمایت اور تقسیم کے مسئلے پر ان کا موقف بھی تاریخی بحث کا اہم حصہ ہے۔

اسی طرح آزادی کی کامیابی کو صرف عدم تشدد کی جدوجہد یا صرف کانگریس کی سیاسی سرگرمی کا نتیجہ قرار دینا بھی تاریخی طور پر بہت سادہ تعبیر ہوگی۔ آزادی کے پس منظر میں دوسری جنگِ عظیم کے اثرات، برطانوی معیشت کی کمزوری، ہندوستانی عوام کی طویل سیاسی مزاحمت، انقلابی تحریکیں، مزدور اور کسان تحریکیں، فوجی بے چینی، عالمی سیاسی حالات اور دیگر عوامل بھی شامل تھے۔

نتیجہ

ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد ایک وسیع اور طویل قومی تحریک تھی، جس میں مختلف سیاسی نظریات، تنظیمیں اور شخصیات شریک تھیں۔ مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور سردار ولبھ بھائی پٹیل اس جدوجہد کے اہم ترین رہنماؤں میں شامل تھے۔

گاندھی نے سیاست کو اخلاقی طاقت اور عدم تشدد کے اصول سے جوڑا اور آزادی کی تحریک کو عوامی سطح تک پہنچایا۔ نہرو نے آزادی کے ساتھ جدید، جمہوری اور سائنسی ہندوستان کا تصور پیش کیا۔ مولانا آزاد نے متحدہ ہندوستان اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے مضبوط آواز بلند کی۔ پٹیل نے تنظیمی قوت اور عملی سیاسی حکمتِ عملی کے ذریعے قومی تحریک کو استحکام دیا۔

ان چاروں شخصیات کا مطالعہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ آزادی کی تحریک کسی ایک فرد، طبقے یا طریقۂ کار کی پیداوار نہیں تھی بلکہ مختلف نظریات اور جدوجہدوں کے مجموعے سے ایک ایسی سیاسی قوت وجود میں آئی جس نے بالآخر برطانوی اقتدار کے خاتمے کی راہ ہموار کی۔

15 اگست 1947ء کو ہندوستان آزاد ہوا اور جواہر لعل نہرو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم بنے۔ نہرو پورٹل کے مطابق انہوں نے 14 اور 15 اگست کی درمیانی شب بحیثیت پہلے وزیر اعظم حلف اٹھایا۔

اس اعتبار سے گاندھی جی کی اخلاقی قیادت، نہرو کی سیاسی بصیرت، آزاد کی فکری و قومی جدوجہد اور پٹیل کی تنظیمی قوت ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کے اہم ابواب ہیں۔ تاہم اس پوری داستان کے مرکز میں وہ کروڑوں عام ہندوستانی بھی ہیں جنہوں نے برسوں تک استعمار کے خلاف جدوجہد کی اور آزادی کی قیمت ادا کی۔

برصغیر کی جدوجہدِ آزادی میں مسلم علماء کا کردار

برصغیر کی جدوجہدِ آزادی میں مسلم علماء کا کردار نہایت اہم اور نمایاں رہا۔ انہوں نے صرف دینی میدان ہی نہیں بلکہ سیاسی، سماجی اور عملی جہاد میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ چند بڑے مسلم علماء مجاہدینِ آزادی درج ذیل ہیں:

نمایاں مسلم علماء مجاہدینِ آزادی:

شاہ ولی اللہ دہلوی

فکری و اصلاحی تحریک کے بانی، جن کے افکار نے بعد کی مزاحمتی تحریکوں کو بنیاد فراہم کی۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی

انہوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف فتویٰ دیا اور آزادی کی فکری بنیاد مضبوط کی۔

سید احمد بریلوی

جہادِ آزادی کی عملی تحریک چلائی اور برطانوی اثرات کے خلاف جدوجہد کی۔

شاہ اسمٰعیل دہلوی

سید احمد شہید کے رفیق، جہاد میں شریک ہوئے اور شہادت پائی۔

1857 اور اس کے بعد کے علماء:

حاجی امام دولہ مہاجر مکی

1857 کی جنگِ آزادی میں اہم روحانی و عملی رہنما:

مولانا رشید احمد گنگوہی

تحریکِ آزادی میں سرگرم، دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں شامل۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی

1857 کے مجاہد، بعد میں تعلیمی محاذ پر بڑی خدمت انجام دی۔

تحریکِ خلافت اور کانگریس کے علماء:

مولانا محمود حسن

ریشمی رومال تحریک کے رہنما، برطانوی سامراج کے خلاف سرگرم۔

مولانا حسین احمد مدنی

جمعیۃ علماء ہند کے قائد، متحدہ قومیت کے نظریے کے حامی۔

مولانا ابوالکلام آزاد

عظیم عالم، مفسر اور سیاسی رہنما، آزادی کی جدوجہد میں کلیدی کردار۔

مولانا محمد علی جوہر

تحریکِ خلافت کے روحِ رواں، صحافت اور سیاست میں نمایاں کردار۔

مولانا شوکت علی

اپنے بھائی کے ساتھ مل کر خلافت تحریک کو مضبوط کیا۔

دیگر اہم علماء

عبیداللہ سندھی

انقلابی عالم، بیرونِ ملک رہ کر آزادی کی تحریک کو منظم کیا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی

غدر تحریک کے رہنما، جلاوطنی میں رہ کر آزادی کی جدوجہد جاری رکھی۔

یہ علماء صرف مذہبی رہنما نہیں تھے بلکہ عملی مجاہد، مفکر اور سیاسی قائد بھی تھے۔ انہوں نے قید و بند، جلاوطنی اور حتیٰ کہ جان کی قربانی دے کر آزادی کی راہ ہموار کی۔

فتویٰ جنگِ آزادی سے مراد وہ مذہبی اعلان (فتویٰ) ہے جو برصغیر کے علماء نے

انگریزوں کے خلاف جدوجہد کو جائز بلکہ فرض قرار دینے کے لیے دیا، خاص طور پر 1857 کی جنگ آزادی کے دوران۔

پس منظر

جب برصغیر پر برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی مضبوط ہوگئی اور ظلم و ناانصافی بڑھنے لگی، تو مسلمانوں اور دیگر مقامی باشندوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ اس وقت علماء نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا غیر ملکی قابض حکومت کے خلاف لڑنا جائز ہے؟

فتویٰ کا اجرا

کئی جید علماء نے اس بات پر اتفاق کیا کہ: انگریز ایک غاصب اور غیر مسلم حکمران ہیں۔ وہ مذہبی، سماجی اور معاشی آزادی سلب کر رہے ہیں اس لیے ان کے خلاف جہاد (آزادی کی جنگ) جائز ہے۔

اہم علماء:

اس فتویٰ میں کئی بڑے علماء شامل تھے، جیسے مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مولانا احمد اللہ شاہ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی۔ انہوں نے باقاعدہ تحریری فتاویٰ جاری کیے جن میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کو دینی فریضہ قرار دیا گیا۔

اہمیت

یہ فتویٰ عوام کو متحد کرنے کا ذریعہ بنا، اس نے مذہبی جواز فراہم کیا اور مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو آزادی کی تحریک میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔

نتیجہ

اگرچہ 1857 کی جنگ آزادی کامیاب نہ ہو سکی، لیکن اس فتویٰ نے برصغیر میں آزادی کی جدوجہد کی بنیاد مضبوط کی اور بعد کی تحریکوں کے لیے راستہ ہموار کیا۔

1857 کی جنگ آزادی کے دوران جو فتویٰ جہاد جنگِ آزادی جاری ہوا، اس کا مکمل مستند متن مختلف تاریخی کتب میں قدرے اختلاف کے ساتھ ملتا ہے۔ اس لیے یہاں ایک مستند خلاصہ مع قریب المعنی متن پیش کیا جا رہا ہے جو اُس فتویٰ کی اصل روح کو ظاہر کرتا ہے:

فتویٰ کا متن (خلاصہ و مفہوم)

"موجودہ حالات میں جب کہ فرنگی (انگریز) حکمرانوں نے ہندوستان پر غلبہ حاصل کر لیا ہے، اور مسلمانوں کے دین، جان و مال اور عزت کو خطرہ لاحق ہے، تو ایسے حالات میں ان کے خلاف جہاد کرنا شرعاً جائز بلکہ فرض ہو جاتا ہے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق اس جدوجہد میں شریک ہو، خواہ جان سے، مال سے یا کسی اور ذریعے سے۔ جو لوگ اس جدوجہد میں شریک ہوں گے وہ مجاہد ہیں، اور اگر اس راہ میں جان دیں تو شہید شمار ہوں گے۔"

اہم نکات

* یہ فتویٰ متعدد علماء نے اجتماعی طور پر دیا۔
* اس میں جہاد کو دفاعی اور آزادی کی جدوجہد قرار دیا گیا۔
* اس کا مقصد عوام کو انگریزوں کے خلاف متحد کرنا تھا۔

مولانا فضلِ حق خیرآبادی برصغیر کے اُن جلیل القدر علماء میں سے تھے جنہوں نے علمی، ادبی اور سیاسی میدان میں نمایاں کردار ادا کیا، خصوصاً 1857 کی جنگِ آزادی کے دوران۔

فتویٰ جہاد 1857 کی تفصیل

1857 میں جب ہندوستان میں انگریز اقتدار کے خلاف بغاوت شروع ہوئی تو متعدد علماء نے اسے مذہبی اور قومی فریضہ قرار دیا۔ انہی میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی بھی شامل تھے، جنہوں نے ایک مشہور فتویٰ جہاد تحریر کیا اور اس پر دستخط کیے۔

فتویٰ کی نوعیت

یہ فتویٰ دراصل انگریزوں کے خلاف جہاد کے جواز پر مبنی تھا۔ اس میں کہا گیا کہ چونکہ انگریز حکومت ظلم، استبداد اور دینی و معاشرتی مداخلت کر رہی ہے، اس لیے اس کے خلاف مزاحمت جائز بلکہ بعض حالات میں فرض ہے۔

فتویٰ میں شرعی اصولوں کی روشنی میں دلائل پیش کیے گئے۔

دستخط اور دیگر علماء

اس فتویٰ پر مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے علاوہ کئی دیگر علماء نے بھی دستخط کیے۔ ان میں مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا کفایت علی کافی وغیرہ شامل تھے۔ یہ اجتماعی دستخط اس بات کی علامت تھے کہ یہ صرف ایک فرد کی رائے نہیں بلکہ علماء کی مشترکہ آواز تھی۔

تاریخی اہمیت

* یہ فتویٰ 1857 کی جدوجہد کو مذہبی جواز فراہم کرنے میں اہم ثابت ہوا۔

☆ اس نے عوام، خصوصاً مسلمانوں، میں انگریزوں کے خلاف مزاحمت کا جذبہ بڑھایا۔ ☆ اس کے نتیجے میں علماء کو سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔

انجام

مولانا فضلِ حق خیرآبادی کو انگریزوں نے گرفتار کر کے مقدمہ چلایا۔ انہیں سزا دے کر انڈمان جزائر (کالا پانی) بھیج دیا گیا، جہاں 1861 میں ان کا انتقال ہوا۔

خلاصہ

مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا دستخط شدہ فتویٰ صرف ایک مذہبی دستاویز نہیں تھا بلکہ آزادی کی تحریک کا فکری اور روحانی منشور تھا، جس نے 1857 کی جنگ کو ایک منظم اور بامقصد جہد میں بدلنے میں مدد دی۔

علمائے ہند

مذہبی شناخت کے محافظ اور تحریکِ آزادی کے معمار

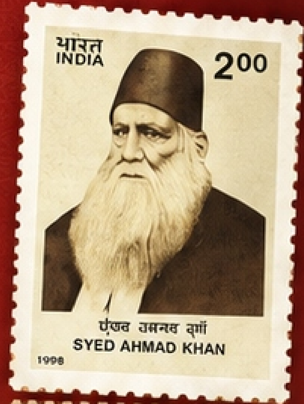

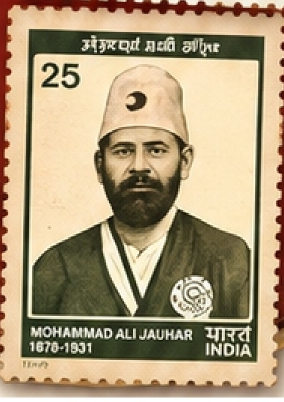

انجم اقبال

(مکہ المکرمہ، سعودی عرب)

مغلیہ دور سے برطانوی استعمار تک فکری تجدید، تعلیمی بیداری اور سیاسی مزاحمت کا ایک روشن باب

تمہید

برصغیر کی تاریخ محض حکمرانوں، سلطنتوں اور معرکوں کا تسلسل نہیں ہے؛ بلکہ یہ ان دانشوروں کی جدوجہد کا احاطہ کرتی ہے جنہوں نے بدلتے ہوئے حالات میں دین، تہذیب اور اجتماعی ضمیر کی پاسداری کی۔ مغلیہ سلطنت کے عروج و زوال، ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے تسلط اور پھر براہِ راست برطانوی حکمرانی کے دوران مسلمان علماء کو بیک وقت متعدد چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف مذہبی عقائد کا خلط ملط ہو جانا، غیر اسلامی رسوم اور اخلاقی پستی کا دور دورہ تھا تو دوسری طرف نوآبادیاتی غلبے، معاشی استحصال اور تہذیبی تسلط کا خطرہ تھا۔

ان حالات میں علماء کا کردار محض ایک ہی طرزِ عمل تک محدود نہ تھا۔ کسی نے تحریر اور تدریس کے ذریعے اصلاحِ معاشرہ کی کوشش کی، کسی نے تعلیمی اداروں اور جامعات کی بنیاد رکھی، کسی نے فتاویٰ اور عوامی تحریکوں کے ذریعے استعمار کا مقابلہ کیا، اور کسی نے مسلمانوں کی بقا کے لیے جدید علوم کے حصول کو ناگزیر قرار دیا۔ ان متنوع راستوں کے باوجود بنیادی مقصد یہی تھا کہ مسلمان اپنی مذہبی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے عصرِ حاضر کے تقاضوں سے نمٹیں اور ناانصافی و محکومی کے خلاف اپنا تاریخی فریضہ انجام دیں۔

مغلیہ عہد: مذہبی آمیزش کے مقابلے میں فکری استقامت

مغلیہ دور میں ہندوستان تہذیبی تنوع کا مرکز تھا۔ مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے باہمی ملاپ نے معاشرے کو وسعت تو بخشی، مگر بعض اوقات ایسی مذہبی آمیزش پیدا ہوئی جسے علماء نے اسلامی عقیدۂ توحید اور شریعت کے لیے خطرہ تصور کیا۔ اکبر کے عہد میں دربار سے وابستہ مخصوص نظریات اور رسوم، بالخصوص دینِ الٰہی، اسی کشمکش کی ایک نمایاں مثال ہیں۔

شیخ احمد سرہندیؒ نے اس دور میں علمی و روحانی اصلاح کی راہ اختیار کی۔ اپنے مکتوبات میں انہوں نے قرآن و سنت سے وابستگی، شریعت کی حاکمیت اور اسلامی شعائر کے تحفظ پر زور دیا۔ بادشاہ کے حضور سجدۂ تعظیمی اور دربار میں رائج غیر اسلامی رسوم پر ان کی تنقید محض فقہی اختلاف نہیں تھی؛ بلکہ وہ دراصل یہ واضح کر رہے تھے کہ سیاسی اقتدار کو مذہبی اصولوں کی تشکیل کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ اسی تجدیدی خدمات کی بنیاد پر انہیں مجددِ الفِ ثانی کا لقب دیا گیا۔

مغلیہ عہد کے آخری مراحل میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے زوال پذیر معاشرے کے مسائل کا وسیع تر تجزیہ کیا۔ انہوں نے فرقہ وارانہ تنازعات، معاشرتی ناہمواری، دینی علوم سے دوری اور رسوم پرستی کی اصلاح کی سعی کی۔ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کر کے انہوں نے عام طبقے کے لیے کتابِ الٰہی تک براہِ راست رسائی کے راستے کھولے۔ ”حجۃ اللہ البالغہ“ جیسی تصانیف میں شریعت کے مقاصد واضح کرتے ہوئے انہوں نے اجتہادی بصیرت، علمی اعتدال اور امت کے

اتحاد کو بیداری کا محور قرار دیا۔ ان کا علمی ورثہ بعد کی متعدد اصلاحی اور مزاحمتی تحریکوں کے لیے مشعلِ راہ بنا۔

کمپنی راج: اصلاح سے مزاحمت تک

1857ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی و معاشی طاقت میں مسلسل اضافہ ہوا۔ مقامی اقتدار کے خاتمے کے ساتھ ہی مذہبی ادارے، اوقاف، روایتی نظامِ تعلیم اور مسلمانوں کی سماجی حیثیت بھی متاثر ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اس نئی حقیقت کا فقہی جائزہ لیا اور برطانوی تسلط کو محض حکومت کی تبدیلی نہیں بلکہ مذہبی، معاشی اور تہذیبی آزادی کے لیے ایک سنگین خطرہ قرار دیا۔ ان کے افکار نے آنے والی نسلوں میں آزادی اور مزاحمت کا شعور اجاگر کیا۔

بنگال میں حاجی شریعت اللہؒ کی فرائضی تحریک نے دیہی مسلمانوں کو بنیادی مذہبی فرائض، توحید اور سماجی انصاف کی طرف راغب کیا۔ اس تحریک نے ہندوانہ اثرات سے جنم لینے والی رسوم، فضول اخراجات اور استحصالی سماجی رویوں کی مخالفت کی۔ دُودُو میاں کی قیادت میں یہی اصلاحی سرگرمیاں زمیندارانہ جبر اور نوآبادیاتی معاشی استحصال کے خلاف اجتماعی آواز بھی بن گئیں۔ یوں مذہبی اصلاح اور معاشرتی انصاف ایک دوسرے سے جڑ گئے۔

1857ء کی جنگِ آزادی میں علماء کی شرکت نے اس مزاحمتی روایت کو عملی طور پر پروان چڑھایا۔ مولوی احمد اللہ شاہ، علامہ فضلِ حق خیرآبادیؒ اور دیگر اہلِ علم نے عوام کو منظم کیا اور بیرونی اقتدار کے خلاف جدوجہد کو مذہبی و اخلاقی جواز فراہم کیا۔ فضلِ حق خیرآبادیؒ کو اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ 1857ء کی تحریک کامیاب نہ ہوسکی، لیکن اس نے یہ ثابت کردیا کہ علماء نوآبادیاتی اقتدار کے سامنے بے حس و حرکت نہیں تھے۔

تعلیم: تہذیبی دفاع کا مضبوط ترین محاذ

1857ء کے بعد جب برطانوی حکومت نے اپنے تسلط کو مستحکم کیا تو مسلمان شدید سیاسی، معاشی اور تعلیمی بحران کا شکار ہو گئے۔ اس مرحلے پر مختلف علمی حلقوں نے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے منفرد مگر اہم حکمتِ عملیاں اپنائیں۔ دارالعلوم دیوبند نے روایتی دینی علوم، سادگی، اصلاحِ رسوم اور عوامی مذہبی رہنمائی کو اپنا محور بنایا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے زیرِ اہتمام یہ درس گاہ جلد ہی ایک ایسے علمی نیٹ ورک میں بدل گئی جس نے سرکاری مدد کے بغیر دینی تعلیم کو برقرار رکھا۔

دوسری جانب سرسید احمد خان نے جدید تعلیم کو مسلمانوں کی بقا کے لیے ناگزیر قرار دیا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا) کے ذریعے انہوں نے سائنس، جدید زبانوں اور عقلی علوم پر توجہ مرکوز کی۔ ان کے بعض نظریات اور برطانوی حکومت کے ساتھ مفاہمانہ رویے پر علماء کے ایک طبقے نے اختلاف کیا، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں میں جدید تعلیم، صحافت اور سیاسی شعور کی نئی راہیں متعارف کروائیں۔

یہاں اختلافات کو محض کشمکش کے طور پر نہیں دیکھنا چاہیے۔ دیوبند نے مذہبی روایات کی خودمختاری کو برقرار رکھا، جبکہ علی گڑھ نے جدید ادارہ جاتی تعلیم میں مسلمانوں کی شمولیت کے راستے ہموار کیے۔ دونوں مکاتبِ فکر نے اپنے اپنے انداز میں ایک شکست خوردہ اور مایوس قوم کو دوبارہ منظم ہونے کا حوصلہ بخشا۔

آزادی کی تحریک میں علماء کی عملی شرکت

بیسویں صدی کے آغاز تک علمی اور تعلیمی بیداری باقاعدہ سیاسی جدوجہد کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی ریشمی رومال تحریک نے بین الاقوامی تعاون کے ذریعے برطانوی اقتدار کے خاتمے کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ منصوبہ مکمل کامیاب نہ ہوا، مگر اس نے علماء کی بین الاقوامی سیاسی بصیرت، تنظیمی مہارت اور آزادی کے لیے ان کی قربانیوں کا منہ بولتا ثبوت پیش کیا۔

تحریکِ خلافت نے مسلم عوام کو غیر معمولی سطح پر متحرک کیا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے رہنماؤں نے خلافتِ عثمانیہ کے تحفظ کو استعمار کے خلاف وسیع تر جدوجہد سے منسلک کیا۔

مولانا آزاد نے اپنے اخبار "الہلال" کے ذریعے آزادی، عدل اور سیاسی خودداری کا پیغام عام کیا۔ خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے اشتراک نے ایک دور تک ہندو مسلم اتحاد کو بھی تقویت بخشی۔

1920ء میں رائج ہونے والی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تعلیمی خودمختاری اور ملی آزادی کے مقاصد کو ہم آہنگ کیا۔ مولانا محمود حسنؒ، مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ساتھیوں کی رہنمائی میں پروان چڑھنے والا یہ ادارہ برطانوی تعلیمی غلبے کے مقابلے میں ایک آزادانہ علمی ماحول کا اعلان تھا۔ بعدازاں ڈاکٹر ذاکر حسین اور دیگر ماہرینِ تعلیم نے اس ادارے کو جدید، باوقار اور قومی فلاح و بہبود سے منسلک یونیورسٹی بنانے میں کلیدی خدمات انجام دیں۔

قومیت اور مستقبلِ ہند: دانشوروں کے متنوع نقطہ نظر

استقلالِ آزادی کے قریب آتے ہی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے حوالے سے علماء کے مابین تضادات نمایاں ہونے لگے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے متحدہ قومیت کا نظریہ پیش کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ ایک مشترک وطن میں مختلف عقائد کے حامل افراد اپنی مذہبی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی ایک سیاسی قوم کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں، جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی متحدہ ہندوستان کے حامی رہے۔

اس کے برعکس کچھ علماء اور مذہبی شخصیات نے مسلم لیگ اور علیحدہ مسلم ریاست کے مطالبے کی تائید کی۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے وابستہ حلقوں بشمول متعدد دانشوروں کا یہ ماننا تھا کہ مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی اور ثقافتی بقا کے لیے ایک علیحدہ سیاسی ڈھانچہ ناگزیر ہے۔ یہ اختلاف اس حقیقت کا ثبوت تھا کہ مسلم علمی روایت یکساں یا جمود کا شکار نہیں تھی؛ بلکہ تمام گروہ بدلتے ہوئے حالات میں امت کے بہترین مستقبل کی تلاش میں تھے، اگرچہ ان کے سیاسی راستے اور نتائج مختلف تھے۔

ایک ہمہ گیر ورثہ

علمائے ہند کی جدوجہد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے دین کی نگہداشت کو محض چند عبادات یا رسم و رواج تک محدود نہیں رکھا۔ ان کے نزدیک عقیدہ، اخلاق، تعلیم، سماجی انصاف، سیاسی آزادی اور تہذیبی خود اعتمادی باہم مربوط عناصر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا علمی ورثہ ہمیں مکتوبات، تفاسیر اور فتاویٰ کے ساتھ ساتھ مدارس، جامعات، صحافت اور عوامی تحریکوں میں بھی نظر آتا ہے۔

ان مخلصانہ کوششوں نے غیر اسلامی رسومات کے خلاف اصلاحی شعور اجاگر کیا، قرآن و سنت سے وابستگی کو مستحکم کیا، جدید علوم کے راستے ہموار کیے اور لاکھوں افراد کو استعماری اقتدار کے خلاف بیدار کیا۔ یہ ان کی فکری وسعت کا برملا ثبوت ہے کہ کسی نے روایات کے تحفظ کو ترجیح دی، کسی نے جدیدیت کے ساتھ مکالمہ کیا، کسی نے متحدہ قومیت کا دفاع کیا اور کسی نے علیحدہ مسلم سیاسی مستقبل کا تصور پیش کیا۔

خلاصہ کلام

مغلیہ عہد سے لے کر آزادیِ ہند تک، مسلمان علماء نے ہر دور کے تقاضوں کا جواب اپنے علمی فہم اور اجتماعی ذمہ داری کے پیشِ نظر دیا۔ شیخ احمد سرہندیؒ کی فکری استقامت، شاہ ولی اللہؒ کی تجدیدی بصیرت، تحریکِ فرائضی کی سماجی اصلاحات، 1857ء کے مجاہد علماء کی قربانیاں، دیوبند و علی گڑھ کے تعلیمی کارنامے، ریشمی رومال تحریک، تحریکِ خلافت کی عوامی بیداری اور جامعہ ملیہ کی خودمختاری یہ تمام مراحل ایک ہی طویل جدوجہد کے مختلف ابواب ہیں۔

موجودہ دور میں اس تاریخ کا تجزیہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ قومیں محض سیاسی اقتدار سے بقا نہیں پا سکتیں؛ ان کی حقیقی طاقت علم، اصول، اخلاقی جرات اور اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت میں مضمر ہوتی ہے۔ علمائے ہند کا روشن ورثہ اسی زندہ شعور کا نام ہے۔ ایسا شعور جو ایمان کی پاسداری کے ساتھ ساتھ عدل، آزادی اور انسانی وقار کے لیے جہدِ مسلسل کا درس دیتا ہے۔

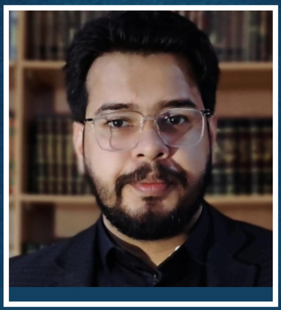

ڈاکٹر حسن مدنی ندوی
(ریسرچر اسلامک یونیورسٹی انڈونیشیا)

مولانا برکت اللہ بھوپالی

برطانوی ہندوستان کے آزاد و متحرک سفارت کار

انیسویں صدی کا عہد وسطی ہندوستان کے لیے ایک ایسا موڑ تھا جس سے واپسی ناگزیر تھی۔ 1857ء کی جنگ آزادی، جسے انگریز نے "غدر" کا نام دیا، اپنی تمام تر بے مثال قربانیوں کے باوجود ناکام ہوئی، اور اس ناکامی نے برصغیر کی سیاسی، تہذیبی اور دینی زندگی کو یکسر بدل ڈالا۔ کمپنی کا اقتدار ختم ہوا تو براہ راست تاج برطانیہ کی حکمرانی قائم ہوگئی، مغل سلطنت کی مکمل تنسیخ ہوئی، اور مسلمانانِ ہند پر شکوک وشبہات کے ایسے بادل چھائے کہ ان کی معاشرت، تعلیم اور معیشت تینوں زخم خوردہ ہوگئیں۔ بھوپال کی چھوٹی سی مسلم ریاست، جہاں اس وقت سکندر بیگم اور بعد میں شاہ جہاں بیگم کی حکمرانی تھی، انگریزوں سے وفاداری کی پالیسی پر قائم تھی اور 1857ء کے طوفان سے محفوظ رہی۔ یہی وہ بظاہر پرسکون ریاستی فضا تھی جس کی گود میں 1854ء میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوا جو آگے چل کر اسی برطانوی اقتدار کے خلاف ساری دنیا میں علم بغاوت بلند کرنے والا تھا۔ گویا تاریخ نے ایک عجیب تضاد رچا، وفادار ریاست کی گود سے ایک عالمی باغی نے جنم لیا۔

اسی دور میں ہندوستان کی دینی و علمی زندگی میں دو بڑے دھارے نمودار ہوئے۔ ایک طرف سرسید احمد خان نے علی گڑھ کی بنیاد رکھ کر مغربی علوم سے مصالحت کی راہ اپنائی، دوسری طرف 1866ء میں دارالعلوم دیوبند کے قیام کے ساتھ ہی علماء کی وہ جماعت منظم ہوئی جس نے استعماری اقتدار کو دینی و سیاسی دونوں محاذوں پر للکارا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک جہاد، جو بالاکوٹ کی چٹانوں میں 1831ء میں خون میں نہا چکی تھی، ابھی تک لوگوں کے دلوں میں زندہ تھی، اور اسی روایت کی ایک کڑی آگے چل کر مولانا محمود حسن اور ان کے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کی ریشمی رومال تحریک کی صورت میں ظاہر ہونے والی تھی۔ 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام، 1905ء میں تقسیم بنگال کے خلاف تحریک، اور اس کے بعد ابھرنے والی انقلابی لہریں، یہ سب اسی زمین کی کوکھ سے پھوٹنے والے مختلف چشمے تھے جن کا سرچشمہ ایک ہی تھا: غلامی کی زنجیر کاٹنے کی تڑپ۔

آزادی کے لیے جہاں ہم نے تاریخ کے صفحات میں مجاہدینِ آزادی کے بارے میں پڑھا ہے، اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قربانیاں تقریباً ہر میدان میں رہی ہیں۔ مگر ان کی وفا، ایثار اور بیش بہا خدمات کا ذکر جب ہم کرتے ہیں تو محض اس نظر سے کرتے ہیں کہ ملک وملت کے لیے انہوں نے کیا کیا، صرفِ نظر اس کے کہ بین الاقوامی سطح پر ان کی قربانیوں کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ چند ایک کے علاوہ، جیسے گاندھی، آزاد، جوہر اور نہرو، جن کی سیاسی پوزیشن اندرونِ ملک مستحکم تھی، یہ تو آزادی کے آخری، سب سے روشن ستارے ہیں۔ ان سے قبل بھی بہت سی ہستیاں گزری ہیں جن کا ذکر ہم سرسری طور پر کرتے ہیں، یا انہیں مخصوص تحریکوں، ریشمی رومال تحریک، سید احمد شہید کی تحریک، یا دیگر انقلابی دھاروں سے جوڑ کر ایک خاص پس منظر کے تحت یاد کرتے ہیں، جیسے چندر شیکھر آزاد یا بھگت سنگھ، محمود حسن۔ غرض ہر مکتبِ فکر نے اپنا ہیرو چن رکھا ہے، مگر کچھ ہستیاں ایسی ہیں جو گمنامی کے دھندلکوں میں کھو جاتی ہیں، حالانکہ ان کی قربانیوں کے چرچے نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک تک پھیلے رہے۔ یہاں نہ صرف دینی وروحانی آزادی کی جنگ ہمارے بزرگوں نے لڑی، بلکہ سیاسی جدوجہد کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سفارت کاری میں بھی جو کردار ان حضرات نے ادا کیا، اگر اس کا کچھ فیصد حصہ بھی ہمارے نصیب میں آجاتا تو ملتِ اسلامیہ ہند یہ اس قدر بحران کا شکار نہ ہوتی۔ سفارت کاری کا اجتماعی زندگی میں وہی مقام ہے جو سیاست کا براہ راست ہے؛ یہ اسی کا

ضمیمہ، اسی کی ایک شاخ ہے، اور تاریخ گواہ ہے کہ سفارت کاری کے ذریعے بسا اوقات وہ مسائل حل ہوئے جو شاید تلوار اور توپ سے بھی حل نہ ہو پاتے۔ صلح حدیبیہ کی مثال سامنے رکھیے: بظاہر ایک نامساعد معاہدہ، جسے بعض صحابہ کرام نے بھی ناپسند کیا، مگر اسی صلح کی چھتری تلے دو برس کے اندر اسلام اتنا پھیلا جتنا برسوں کی جنگوں میں نہ پھیل سکا تھا، اور بالآخر فتح مکہ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر مکمل ہوئی۔ اسی طرح بیسویں صدی میں کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے (1978ء) نے مصر اور اسرائیل کے درمیان تین دہائیوں کی متواتر جنگوں کا وہ سلسلہ ختم کر دیا جسے چار بڑی جنگیں بھی ختم نہ کر سکی تھیں۔ گویا سفارت کاری وہ خاموش تلوار ہے جو بغیر خون بہائے فیصلے کن معرکے سر کر لیتی ہے، اور یہی وہ میدان ہے جس میں مولانا برکت اللہ بھوپالی کی زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

تاریخِ ہند کا وہ دور انتہائی کرب ناک تھا جب 1857 کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد برصغیر پر برطانوی سامراج کا تسلط مکمل ہو چکا تھا۔ دہلی اور لکھنؤ جیسے عظیم الشان علمی و تہذیبی مراکز اجڑ چکے تھے اور ہر طرف مایوسی، جبر اور غلامی کا گہرا سایہ چھایا ہوا تھا۔ ایسے پر آشوب اور تاریک وقت میں وسطی ہند کی ریاست بھوپال علم و فضل کا ایک نیا اور مستحکم مرکز بن کر ابھری۔ عہدِ شاہجہانی میں بیگم صاحبہ بھوپال اور ان کے شوہر نواب صدیق حسن خان کی علم پروری اور قدر دانیوں نے ہر مکتبِ فکر کے اربابِ فضل و کمال کو بھوپال میں جمع کر دیا تھا۔ نواب صدیق حسن خان، جو خود ایک عظیم دینی مصنف اور سلفی تحریک کے بانیوں میں سے تھے، نے بھوپال کو اس علمی تحریک کا مرکز بنا دیا تھا جس میں براہِ راست قرآن و سنت پر عمل کی دعوت دی جاتی تھی۔ یہ وہی علمی، روحانی اور کسی حد تک برطانوی سامراج کے خلاف خفیہ جذبات رکھنے والا ماحول تھا جس میں مولانا برکت اللہ بھوپالی نے ہوش و شعور کی آنکھیں کھولیں۔

مولانا برکت اللہ کی پیدائش 7 جولائی 1854ء کو بھوپال کے محلہ اٹاوہ میں ہوئی۔ ایک متوسط، بلکہ نچلے متوسط گھرانے کا یہ بچہ ابتدا ہی سے باغیانہ مزاج لیے پیدا ہوا تھا۔ بھوپال کے دینی ماحول میں تعلیم پائی، رسمی علوم سے فراغت کے بعد مولانا نے بھوپال میں مدرس کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس دور میں عام مولویوں کے نزدیک انگریزی پڑھنا معیوب یا حرام سمجھا جاتا تھا، لیکن مولانا برکت اللہ، جو عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں اور برطانوی سامراج کے ہتھکنڈوں کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے، اس نتیجے پر پہنچے کہ دشمن کو اس کی زبان اور اس کے علوم کے بغیر شکست نہیں دی جا سکتی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مغربی اقوام کی استعماری پالیسیوں کو سمجھنے کے لیے انگریزی پر عبور ناگزیر ہے۔ اور 1882ء میں سید جمال الدین افغانی سے ملاقات کی، جن کے افکار نے نوجوان برکت اللہ کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا اور حریت کی وہ آگ بھڑکا دی جو تاحیات نہ بجھ سکی۔ پھر اچانک، 1883ء میں، وہ بھوپال سے پراسرار طور پر غائب ہو کر بمبئی جا پہنچے، جہاں ولسن ہائی اسکول کھیت واڑی میں داخلہ لیا، ایک ایسے طالب علم کی حیثیت سے جو عمر میں اپنے ہم جماعتوں سے کہیں بڑا تھا، مگر جسے علم کی پیاس نے ابتدائی جماعتوں میں بیٹھنے سے بھی گریز نہ دلایا۔ کسی مسٹر اسکاٹ سے انگریزی کے نجی اسباق کے عوض اردو پڑھانے کا معاہدہ کیا، اور

محض تین برس کی محنت میں یونیورسٹی داخلے کے امتحان کے قابل ہو گئے۔ 1887ء میں لندن پہنچے اور وہاں عربی، فارسی اور اردو کے نجی معلم کی حیثیت سے کام کرنے لگے، اور اسی دوران خود جرمن، فرانسیسی اور جاپانی زبانیں بھی سیکھ لیں۔ یوں ایک ایسا انسان تیار ہوا جس کی زبان ہی اس کا پاسپورٹ بن گئی، وہ زبان جو مشرق و مغرب کی سرحدوں کو بیک وقت عبور کر سکتی تھی۔

لندن میں قیام کے دوران برکت اللہ کا رابطہ ہندوستانی انقلابیوں کے مرکز "انڈیا ہاؤس" سے ہوا، اور 1897ء میں وہ مسلم پیٹریاٹک لیگ کے اجلاسوں میں شامل کرشن ورما جیسے انقلابیوں کے ہمراہ نظر آتے ہیں۔ اسی زمانے میں ایک ایسا موڑ آیا جس نے ان کی زندگی کو ایک نئی سمت دی، 1895ء میں انگریز نومسلم عبد اللہ قلیم نے انہیں لیورپول مسلم انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے کی دعوت دی۔

یہاں 1893ء سے 1896ء تک وہ امام اور معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، لیکن ان کا اصل کام دنیا بھر کے مسلم حکمرانوں اور اہلِ خیر کے نام اردو، عربی اور فارسی میں خط و کتابت کی ایک مہم چلانا تھا۔ اسی مکتوب نگاری کی برکت تھی کہ افغان دربار سے ان کا سب سے بڑا کامیاب رابطہ قائم ہوا، اور نتیجتاً افغان ولی عہد نے 1895ء میں مسجد کے دورے پر آ کر اس کی تعمیر کے لیے بھاری عطیہ دیا۔ اسی برس 1895ء میں برکت اللہ کی شناسائی امیر افغانستان کے بھائی نصر اللہ خان سے ہوئی، یہ وہ رشتہ تھا جو بیس برس بعد کابل کی سرزمین پر عبوری حکومتِ ہند کے قیام کی راہ ہموار کرنے والا تھا۔ لیورپول یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں بھی درس و تدریس کے فرائض انجام دیے، مگر ادارے کے طرزِ عمل سے بتدریج دوری اختیار کر لی۔

ایک عرصے بعد لندن کی گھٹی ہوئی اور سامراجی فضاؤں سے نکل کر مولانا نے نئی دنیا، امریکہ کا رخ کیا۔ ان کا امریکہ کا یہ پہلا سفر ایک امریکی سیاح مسٹر الیگزینڈر رویب کی دعوت پر ہوا تھا۔ امریکہ کی آزاد فضا میں انہیں اپنے افکار کو مزید وسعت دینے کا موقع ملا۔ وہیں سے انہوں نے جون 1905 میں مولانا حسرت موہانی کے مشہور رسالے "اردوئے معلیٰ" (علی گڑھ) کے لیے ایک انتہائی بصیرت افروز اور تاریخی مقالہ تحریر کیا۔ ہندوستان کی آزادی سے نصف صدی قبل لکھے گئے اس مقالے میں مولانا نے حیرت انگیز سیاسی اور معاشی شعور کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ کس طرح برطانوی جونکیں ہندوستان کا خون چوس رہی ہیں، اور کس طرح انگلستان کی پارلیمنٹ نے ظالمانہ ٹیکس لگا کر ہندوستان کی صدیوں پرانی صنعت و حرفت کو تباہ کر دیا ہے۔ اسی مقالے میں انہوں نے اس دور میں ایک انتہائی غیر مانوس اور جرات مندانہ آواز بلند کی کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کا باہمی اتحاد ناگزیر ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ جس طرح 1857 میں سب نے مل کر جدوجہد کی تھی، اب پھر وقت آ گیا ہے کہ اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے یا دیگر مشترکہ جدوجہد کے ذریعے سامراج کا مقابلہ کیا جائے۔

بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا تو برکت اللہ کی سفارت کاری مشرقِ بعید کی طرف بڑھی۔ 1909ء میں جاپان پہنچے اور ٹوکیو یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں "اسلامک فریٹرنٹی" کے نام سے ایک جریدہ جاری کیا، اور بعد ازاں "الاسلام" کے نام سے ایک اخبار، جسے برطانوی ہند میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔ نتیجتاً برطانوی دباؤ کے تحت 1914ء میں ان کی یونیورسٹی کی ملازمت ختم کر دی گئی۔ یہ خود ایک لمحہ فکریہ تھا، ایک اکیلے عالم کے قلم سے سلطنتِ برطانیہ خائف ہو گئی تھی۔ لیکن اس برطرفی نے برکت اللہ کا حوصلہ توڑنے کے بجائے انہیں مزید آزاد کر دیا، انہوں نے پوری دنیا کو اپنا میدانِ عمل بنا لیا۔ 1913ء میں وہ سان فرانسسکو میں غدر پارٹی کے بانی اراکین میں شامل ہوئے، جس نے پنجابی تارکینِ وطن کی انقلابی توانائی کو ایک منظم تحریک کی شکل دی۔ غدر پارٹی کا واضح نصب العین برطانوی حکومت کا مسلح بغاوت کے ذریعے تختہ الٹنا اور ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جمہوری حکومت کا قیام تھا۔ مولانا برکت اللہ اس پارٹی کے نمایاں ترین رہنماؤں میں سے تھے جنہوں نے امریکہ اور کینیڈا کے طوفانی دورے کیے، وہاں مقیم ہزاروں سکھ، ہندو اور مسلمان تارکینِ وطن کے دلوں میں حریت کی آگ بھڑکائی، اور اخبار "غدر" کے ذریعے شعلہ بار مقالات تحریر کیے۔ مولانا کی شائستگی، فراخ دلی اور وسیع النظری نے غدر پارٹی کے تمام مذاہب کے ارکان میں انہیں ایک قابلِ احترام قائد بنا دیا تھا، برکت اللہ نے اپنی عمر اور علمی وقار کے ساتھ اس نوجوان تحریک اور پرانے پان اسلامی نیٹ ورک کے درمیان ایک زندہ پل کا کام دیا۔

پھر 1914ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑی، اور دنیا کا نقشہ بدلنے لگا۔ جرمنی میں مقیم

ہندوستانی انقلابیوں نے ”برلن کمیٹی“ کے نام سے ایک تنظیم بنائی، اور برکت اللہ کو بھی اس کارواں میں شامل کیا گیا۔ قیصر ولیم دوم کی جانب سے راجا مہندر پرتاپ کی مہم کی تائید میں پیغامات بھجوائے گئے، اور یوں ایک شاہی دربار سے دوسرے شاہی دربار تک آزادی کا پیغام پہنچانے کا کٹھن سفر شروع ہوا۔ 1915ء میں نیدرمائر-ہینٹگ مہم کے تحت، جسے ”کابل مشن“ بھی کہا جاتا ہے، برکت اللہ، راجا مہندر پرتاپ اور دیگر برلن کمیٹی کے اراکین نے فارس کے صحراؤں کو عبور کرکے افغانستان کا رخ کیا۔ یہ سفر جان جوکھوں کا تھا، کبھی برطانوی اور روسی جاسوسوں سے بچنا، کبھی سنگلاخ صحراؤں میں دنوں تک پانی کی تلاش۔ اکتوبر 1915ء میں پغمان کے مقام پر امیر حبیب اللہ خان سے آٹھ گھنٹے طویل ملاقات ہوئی، جس میں برکت اللہ نے امیر کو برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کی دعوت دی اور ترک و جرمن افواج کو افغانستان سے گزرنے کی اجازت دینے کی تجویز پیش کی۔ امیر، جو نہایت محتاط طبیعت کے مالک تھے، نے اس وفد کو تاجروں سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی پسند کے مطابق ہی سودا کریں گے، مگر اس محتاط رویے کے باوجود دروازہ بند نہ ہوا۔

اور پھر وہ تاریخی دن آیا جس نے ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کو ایک نیا رخ دیا۔ یکم دسمبر 1915ء کو راجا مہندر پرتاپ کی اٹھائیسویں سالگرہ کے دن، کابل میں عبوری حکومتِ ہند کا اعلان ہوا، راجا مہندر پرتاپ صدر، مولانا برکت اللہ وزیرِ اعظم، اور مولانا عبید اللہ سندھی وزیرِ داخلہ مقرر ہوئے۔ یہ صرف ایک علامتی اقدام نہ تھا، یہ غلام ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک آزاد، خودمختار حکومت کا تصور تھا جو اپنی ہی سرزمین سے باہر، مگر اپنے ہی عوام کے نام پر قائم ہوئی تھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی زمانے میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے رفیقِ خاص مولانا عبید اللہ سندھی کی ریشمی رومال تحریک بھی پوری آب و تاب سے جاری تھی۔ مولانا عبید اللہ سندھی کابل میں امیر افغانستان سے روابط استوار کر رہے تھے جبکہ شیخ الہند حجاز جا کر ترکوں سے مدد طلب کر رہے تھے، اور انہی خطوط کی صورت میں، جو ریشم کے کپڑے پر لکھے جاتے، غالب نامہ کے نام سے مشہور خفیہ پیغامات کا سلسلہ چلا۔ یوں دیوبند کی علمی روایت اور برلن کمیٹی کی جدید انقلابی سفارت کاری ایک ہی نکتے پر آ کر مل گئیں، کابل کی گلیوں میں، ایک ہی مقصد کے لیے۔ برکت اللہ نے افغان دربار کے سرکاری اخبار ”سراج الاخبار“ کی ادارت میں محمود طرزی کے دست و بازو کا کردار بھی ادا کیا، اور اسی اخبار کے ذریعے ہندوستان کی آزادی کا پیغام سرحد کے اس پار پہنچایا۔

لیکن سیاست کی راہیں کبھی سیدھی نہیں ہوتیں۔ 1917ء میں امیر حبیب اللہ خان ناراض ہو گئے اور برکت اللہ اور راجا مہندر پرتاپ کو افغانستان چھوڑنے کا کہا گیا۔ یہیں سے برکت اللہ کی زندگی کا وہ باب شروع ہوتا ہے جو ان کی سفارت کاری کی سب سے بلند پرواز ثابت ہوا۔

1917 میں جب روس میں بالشویک انقلاب برپا ہوا تو عالمی سیاست کا رخ یکسر تبدیل ہو گیا۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی، جو ہر بدلتے ہوئے عالمی منظر نامے پر عقاب جیسی نظر رکھتے تھے، نے زارِ روس کے زوال کو مشرقی اقوام اور بالخصوص ہندوستان کی آزادی کے لیے ایک سنہری موقع سمجھا۔ وہ کابل سے دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے ماسکو پہنچ گئے۔ یہ ان کی عظیم سفارتی کامیابیوں میں سے ایک تھی کہ 1919 میں انہوں نے سوویت روس کے بانی اور عظیم اشترا کی رہنما ولادیمیر لینن سے ملاقات کی۔ روسی اخبار ”پراودا“ نے ان کا ایک تفصیلی انٹرویو شائع کیا جس میں انہوں نے واضح کیا کہ گو کہ وہ اشتراکیت (کمیونزم) کے حامی نہیں اور اسلام کے معاشی و سماجی نظام پر کامل یقین رکھتے ہیں، تاہم برطانوی سامراجیت کے خلاف جنگ میں سوویت روس اور مشرقی اقوام کے مفادات مشترک ہیں۔ انہوں نے لینن کو قائل کیا کہ جب تک ہندوستان برطانوی پنجۂ استبداد سے آزاد نہیں ہوتا، ایشیا میں سامراجیت کا خاتمہ ناممکن ہے۔ اس دور میں یہ بھی اطلاعات ملتی ہیں کہ انہوں نے یورپ کے دیگر طاقتور رہنماؤں، بشمول اٹلی وغیرہ کے سیاسی زعما، تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ ہندوستان کے حق میں ہر ممکنہ عالمی طاقت کا اخلاقی و مادی تعاون حاصل کیا جا سکے۔ وہ دنیا کے جس دارالحکومت میں بھی گئے، چاہے وہ برلن ہو، ماسکو ہو، پیرس ہو، ٹوکیو ہو یا سان فرانسسکو، ان کی حیثیت عام آدمی کی نہیں تھی، بلکہ وہ برطانوی ہندوستان کی مقید قوم کے ایک باوقار اور آزاد روح سفارت کار کی حیثیت سے دنیا کے سامنے کھڑے ہوئے۔ روس کے سفر کے دوران، ترکستان کے صحراؤں اور شہروں میں گھومتے ہوئے، برکت اللہ نے فارسی زبان میں ایک رسالہ تحریر کیا جس کا انگریزی عنوان ”بالشیوزم اینڈ دی اسلامک باڈی پولیٹک“ رکھا

گیا، جو انہوں نے وسط ایشیا بھر میں تقسیم کیا، اور جس کی ایک نقل بالآخر برطانوی خفیہ ایجنسی کے ہاتھ لگی۔ اس رسالے میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اشتراکیت کا وہ روحِ رواں، مظلوم مزدور اور کسان کو عزت و انصاف دلانا، دراصل اسلام کے پیغام سے کوئی اجنبی چیز نہیں، بلکہ اسی عدل و مساوات کی ایک اور صورت ہے جس کی طرف انبیاء نے دعوت دی تھی۔ یہ ایک نہایت جرات مندانہ فکری کاوش تھی، جس نے پان اسلامیت اور اشتراکیت کے درمیان ایک ایسا مکالمہ قائم کرنے کی کوشش کی جو اپنی مثال آپ تھا۔ برطانوی دفتر خارجہ کی ایک رپورٹ نے برکت اللہ کو پان اسلامی تحریک، ''ایشیا برائے ایشیائی باشندے'' کے تصور، اور ہندوستانی بغاوت، ان تینوں مختلف دھاروں کے درمیان ایک کڑی قرار دیا، جبکہ ایک جرمن سفارت کار نے ان کے بارے میں لکھا کہ وہ سب سے پہلے قوم پرست تھے اور اس کے بعد مسلمان، ایسی گواہیاں جو خود ان کے مخالفین کی زبان سے ان کی وسعتِ نظر کی تصدیق کرتی ہیں۔

برکت اللہ کی سفارت کاری کسی خزانے، کسی فوج، یا کسی مستقل سرزمین کے سہارے نہ تھی۔ ان کے پاس بس ایک زبان تھی، ایک قلم تھا، اور سرحدوں کو عبور کرنے کا عزم تھا۔ انگلستان، جرمنی، ترکی، افغانستان، روس، وسط ایشیا، جاپان، امریکہ، یہ سب اسٹیشن تھے اس ایک سفر کے جس کا مقصد ایک ہی تھا: ہندوستان کی آزادی کو ایک مقامی مسئلے سے نکال کر عالمی ضمیر کے سامنے پیش کرنا۔ یہی وہ کارنامہ ہے جسے تاریخ کے عام طالب علم اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ آزادی کی جنگ صرف دلی کی گلیوں یا پنجاب کے میدانوں میں نہیں، بلکہ ماسکو کے دربار، برلن کی راہداریوں اور کابل کے محلات میں بھی لڑی گئی، اور برکت اللہ اس محاذ کے صف اول کے سپاہی تھے۔

امان اللہ خان کے دورِ اقتدار میں افغانستان کی برطانیہ سے صلح ہوگئی تو کابل مشن کی سیاسی افادیت کمزور پڑنے لگی، مگر برکت اللہ کا حوصلہ ماند نہ پڑا۔ 1926ء میں وہ ایک بار پھر امریکہ لوٹے، اور وہاں مشہور افریقی نژاد رہنما مارکس گاروے کے ساتھ مل کر ایک ایسی جدوجہد میں شریک ہوئے جس کا مقصد استعمار کے خلاف عالمی مظلوموں کے اتحاد کو فروغ دینا تھا۔ ان کی زندگی کی آخری جھلک نہایت پرسوز ہے، 1927ء کی ایک گرم شام میری ول، کیلیفورنیا کے ایک ہال میں آٹھ سو سے زائد ہندوستانیوں کا مجمع جمع تھا۔ ایک بوڑھا، نحیف شخص اسٹیج پر آیا، ہمیشہ کی طرح پرجوش انداز میں تقریر شروع کی، مگر اچانک رک گیا، الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ آواز جس نے کبھی برطانوی سلطنت کے ایوانوں کو لرزا دیا تھا، اب خاموش ہونے والی تھی۔ 20 ستمبر 1927ء کو سان فرانسسکو میں ذیابیطس کی پیچیدگیوں کے باعث ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے جنازے میں ہندو، سکھ اور مسلمان سب شریک ہوئے، گویا وہی اتحاد جس کی وہ ساری زندگی تبلیغ کرتے رہے، ان کی وفات پر عملی صورت میں سامنے آ گیا۔ ان کی میت سان فرانسسکو سے سیکرامنٹو لے جائی گئی، جہاں انہیں مسلم قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا اور وہ آج بھی اپنی مادرِ وطن سے ہزاروں میل دور، ایک اجنبی سرزمین میں آرام فرما ہیں۔

اگر ہم برکت اللہ بھوپالی کی زندگی کو ایک جملے میں سمیٹنا چاہیں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کا وجود خود ایک متحرک سفارت خانہ تھا، بغیر عمارت، بغیر پرچم، بغیر تنخواہ کے عملے کے۔ ان کی آزادی کی آرزو، جس کی خاطر انہوں نے اپنا سارا جیون بیرونِ وطن گزار دیا، بالآخر ان کی وفات کے بیس برس بعد، 1947ء میں پوری ہوئی، اگرچہ وہ خود اسے دیکھنے کے لیے موجود نہ رہے۔ 1988ء میں ان کے اعزاز میں بھوپال یونیورسٹی کا نام تبدیل کر کے برکت اللہ یونیورسٹی رکھا گیا، جو ان کی خدمات کا ایک بہت ہی چھوٹا سا اعتراف ہے۔ مگر جس مقصد کے لیے انہوں نے پان اسلامیت اور اشتراکیت کے درمیان مکالمہ قائم کرنے کی کوشش کی، جس فرقہ وارانہ تعصب سے بالاتر عالمی مسلم یکجہتی کا خواب انہوں نے دیکھا، جس آزاد روح، نہ کسی سلطنت کی محتاج، نہ کسی نظریے کی اسیر کی وہ تجسیم تھے، وہ مقاصد آج بھی، سو برس گزر جانے کے باوجود، ادھورے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ آج بھی اس بات کی محتاج ہے کہ اپنے مسائل کے حل کے لیے صرف داخلی سیاست پر انحصار نہ کرے، بلکہ برکت اللہ کی طرح دنیا کے ہر دربار، ہر زبان، اور ہر افکار کے دھارے میں اپنی بات پہنچانے کا حوصلہ پیدا کرے۔ ایک ایسا انسان جس نے بھوپال کی گلیوں سے کریملن کے دروازوں تک کا سفر محض اپنی زبان اور اپنے یقین کے سہارے طے کیا، اس سے سیکھنے کے لیے ابھی بہت کچھ باقی ہے، اور شاید یہی اس عظیم مردِ مجاہد کو سب سے بڑا خراجِ عقیدت ہوگا کہ ہم اس کے نامکمل خوابوں کی تکمیل کا بیڑا اٹھائیں۔

ہندوستان کی آزادی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا کردار

محمد ابوبکر

ریسرچ اسکالر، مونگیر یونیورسٹی (مونگیر، ہندوستان)

ہندوستان کی تحریکِ آزادی دنیا کی عظیم ترین قومی تحریکوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس تحریک میں بے شمار رہنماؤں نے اپنی جان، مال، علم اور صلاحیتیں وطن کی آزادی کے لیے وقف کیں۔ ان عظیم رہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام نہایت عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ ایک بلند پایہ عالمِ دین، مفسرِ قرآن، صحافی، ادیب، مفکر، خطیب اور مدبر سیاست دان تھے۔ انہوں نے نہ صرف انگریزی استعمار کے خلاف بھرپور جدوجہد کی بلکہ ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی اور مشترکہ ہندوستانی قومیت کے نظریے کو بھی مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ ان کی سیاسی بصیرت، بے مثال خطابت اور فکری رہنمائی نے تحریکِ آزادی کو نئی قوت اور سمت عطا کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد 1886ء کے اواخر میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ (ڈاکٹر شائستہ بیدار جرنل 2023 خدا بخش لائبریری پٹنہ) مشہور تاریخ پیدائش 11 نومبر 1888 ہے بعد ازاں ان کا خاندان کلکتہ (موجودہ کولکاتا) منتقل ہوگیا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور کم عمری ہی میں عربی، فارسی، اردو اور اسلامی علوم میں غیر معمولی مہارت حاصل کرلی۔ مطالعے اور وسیع علمی ذوق نے ان میں قومی بیداری پیدا کی اور وہ نوجوانی ہی سے برطانوی استعمار کے خلاف آواز بلند کرنے لگے۔

مولانا آزاد نے صحافت کو آزادی کی جدوجہد کا مؤثر ذریعہ بنایا۔ انہوں نے 1912ء میں ہفت روزہ الہلال جاری کیا، جس کے ذریعے مسلمانوں میں آزادی کا شعور، سیاسی بیداری اور قومی احساس پیدا کیا۔ اس رسالے میں انہوں نے انگریز حکومت کی پالیسیوں پر سخت تنقید کی اور ہندوستانیوں کو غلامی کے خلاف متحد ہونے کی تلقین کی۔

بعد ازاں انہوں نے البلاغ جاری کیا، جس نے بھی قومی تحریک کو تقویت بخشی۔ انگریزی حکومت نے ان کی تحریروں سے خوفزدہ ہوکر دونوں رسائل پر پابندی عائد کردی اور مولانا آزاد کو متعدد مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

مولانا آزاد نے صحافت کو عوامی بیداری اور ثقافتی اصلاح کا مؤثر ذریعہ بنایا۔ ان کے ہفت روزہ رسائل الہلال اور البلاغ نے ہندوستان کے مسلمانوں میں علمی شعور، سیاسی بیداری، قومی احساس اور تہذیبی اعتماد پیدا کیا۔ ان رسائل کی زبان نہایت شستہ، بلیغ اور ادبی حسن سے بھرپور تھی۔ انہوں نے اردو صحافت کو نئی فکری جہت عطا کی اور نوجوان نسل میں آزادی، خودداری اور قومی خدمت کا جذبہ پیدا کیا۔ ان کی تحریروں نے اردو نثر کو ایک نئی ادبی شان بخشی اور قومی صحافت کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔

کانگریس میں قیادت

مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستانی قومی کانگریس میں اہم کردار ادا کیا۔ 1923ء میں وہ کانگریس کے سب سے کم عمر صدر منتخب ہوئے۔ بعد میں 1940ء سے 1946ء تک مسلسل کانگریس کے صدر رہے، جو ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا نہایت اہم دور تھا۔

ان کی قیادت میں کانگریس نے برطانوی حکومت کے خلاف متحدہ جدوجہد جاری رکھی۔ انہوں نے مختلف سیاسی جماعتوں اور سماجی طبقات کو آزادی کے مشترکہ مقصد پر متحد رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔

مولانا آزاد نے مہاتما گاندھی کی عدم

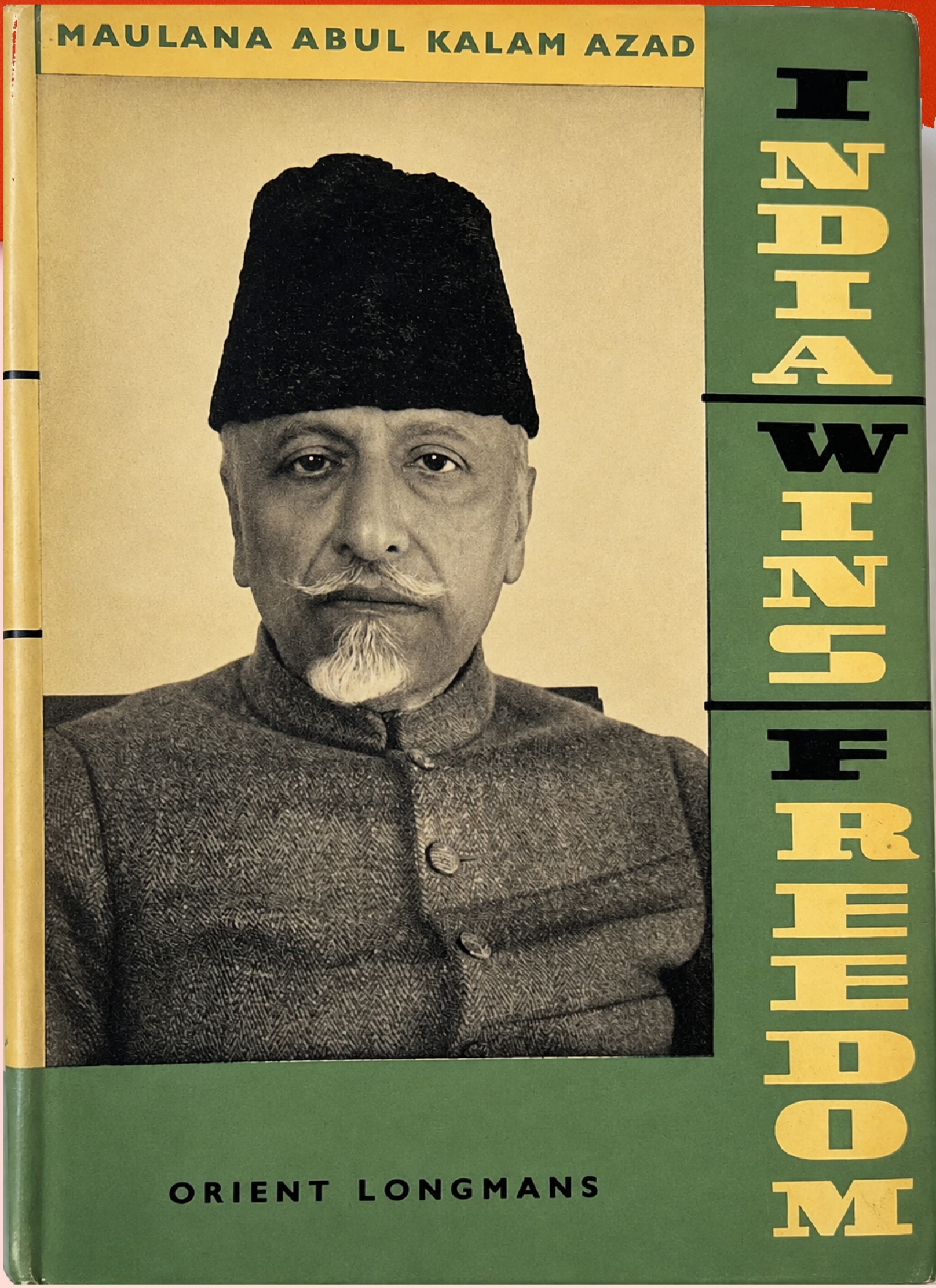

۱۹۵۹ میں چھپی مولانا آزاد کی ''اِنڈیا ونس فریڈم'' کا سرورق

اس کتاب میں مولانا نے مختلف جگہوں سے تیس صفحات نکال دیئے تھے اور وصیت فرمائی تھی کہ ان تیس صفحات کو ان کے انتقال کے ۳۰ سال بعد ۱۹۸۸ء میں شائع کیا جائے۔

تعاون تحریک اور سول نافرمانی تحریک کی بھرپور حمایت کی۔ انہوں نے عوام سے اپیل کی کہ وہ انگریز حکومت کے اداروں، مصنوعات اور قوانین کا پرامن بائیکاٹ کریں۔ ان تحریکوں میں سرگرم حصہ لینے کی وجہ سے انہیں کئی بار گرفتار کیا گیا، مگر انہوں نے کبھی اپنے اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا۔

بھارت چھوڑو تحریک

1942ء کی ”بھارت چھوڑو تحریک“ کے دوران مولانا آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ انہوں نے آزادی کے مطالبے کو مزید مضبوط انداز میں پیش کیا۔ تحریک کے آغاز ہی میں انہیں دیگر قومی رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا اور وہ تقریباً تین سال تک قید میں رہے۔

مولانا آزاد کا سب سے نمایاں کارنامہ ہندو مسلم اتحاد کا فروغ تھا۔ وہ اس نظریے کے مضبوط حامی تھے کہ ہندوستان مختلف مذاہب اور ثقافتوں کا مشترکہ وطن ہے۔ ان کا یقین تھا کہ آزادی کی کامیابی صرف قومی اتحاد سے ممکن ہے۔

انہوں نے مذہبی منافرت اور فرقہ واریت کی ہمیشہ مخالفت کی اور دونوں بڑی قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی مسلسل کوشش کی۔ ان کی تقریریں آج بھی قومی یکجہتی کی بہترین مثال سمجھی جاتی ہیں۔

مولانا آزاد تقسیمِ ہند کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب کی بنیاد پر ملک کی تقسیم مستقبل میں دونوں ممالک کے لیے مسائل پیدا کرے گی۔ انہوں نے اپنی کتاب ”India Wins Freedom“ میں تقسیم کے اسباب اور اس کے نتائج پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

انہوں نے صحافت، سیاست، خطابت، تعلیم اور قومی قیادت کے ذریعے آزادی کی جدوجہد کو نئی روح بخشی۔ ان کی زندگی قربانی، استقامت، حب الوطنی، اتحاد اور علم دوستی کی روشن مثال ہے۔

آج بھی ان کا کردار ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ کسی قوم کی حقیقی ترقی اتحاد، تعلیم، برداشت اور مشترکہ قومی شعور میں مضمر ہے۔

برصغیر کی تحریکِ آزادی محض ایک سیاسی جدوجہد نہ تھی بلکہ یہ ایک عظیم تہذیبی، تعلیمی اور ثقافتی تحریک بھی تھی، جس کا مقصد ہندوستان کے عوام کو غلامی سے نجات دلانے کے ساتھ ساتھ ان کی فکری، علمی اور ثقافتی شناخت کو محفوظ رکھنا تھا۔ اس تحریک میں جن شخصیات نے سیاسی قیادت کے ساتھ ساتھ فکری اور ثقافتی میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں، ان میں مولانا آزاد کا نام سرفہرست ہے۔

مولانا آزاد کا یقین تھا کہ ہندوستان کی اصل طاقت اس کی گنگا جمنی تہذیب، مذہبی رواداری، علمی روایت اور ثقافتی تنوع میں مضمر ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی پوری زندگی ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے تحفظ اور فروغ کے لیے وقف کردی۔

مولانا آزاد متحدہ ہندوستان کے سب سے بڑے حامی تھے۔ ان کے نزدیک ہندو اور مسلمان صدیوں سے ایک ہی سرزمین پر رہتے آئے ہیں اور ان کی تہذیب، زبان، رہن سہن اور معاشرت ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ وہ اس نظریے کے سخت مخالف تھے کہ مذہب کی بنیاد پر قومیں الگ ہوجاتی ہیں۔

مولانا آزاد نے اپنی تقاریر اور تحریروں میں بارہا اس حقیقت پر زور دیا کہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کئی صدیوں کی مشترکہ محنت کا نتیجہ ہے، جس میں تمام مذاہب اور قوموں نے برابر کا حصہ لیا ہے۔ انہوں نے قومی یکجہتی کو ہندوستان کی سب سے بڑی ثقافتی طاقت قرار دیا اور آزادی کی جدوجہد کو اسی مشترکہ ورثے کے تحفظ کا ذریعہ بنایا۔

مولانا آزاد اردو زبان کے عظیم محسن تھے۔ انہوں نے اپنی تصانیف، خطبات اور مضامین کے ذریعے اردو ادب کو نئی وسعت عطا کی۔ ان کی مشہور کتابیں غبارِ خاطر اور ترجمان القرآن اردو نثر کے شاہکار شمار ہوتی ہیں۔

ان کی تحریروں میں مذہبی فکر، فلسفہ، تاریخ، ادب اور ثقافت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ انہوں نے اردو کو قومی رابطے کی زبان کے طور پر فروغ دیا اور اسے ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی شناخت کا اہم ستون قرار دیا۔

آزادی کے بعد جب مولانا ابوالکلام آزاد آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم بنے تو انہوں نے قومی تعمیر میں تعلیم اور ثقافت کو بنیادی حیثیت دی۔ ان کے نزدیک تعلیم صرف روزگار کا ذریعہ نہیں بلکہ انسان کی شخصیت، اخلاق اور تہذیب کی تعمیر کا وسیلہ ہے۔

انہوں نے سائنسی تعلیم، فنی تعلیم، اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کے فروغ کے لیے متعدد اداروں کی بنیاد رکھی۔ ان کی کوششوں سے ملک میں علمی ماحول پیدا ہوا اور تعلیم کو قومی ترقی کا بنیادی

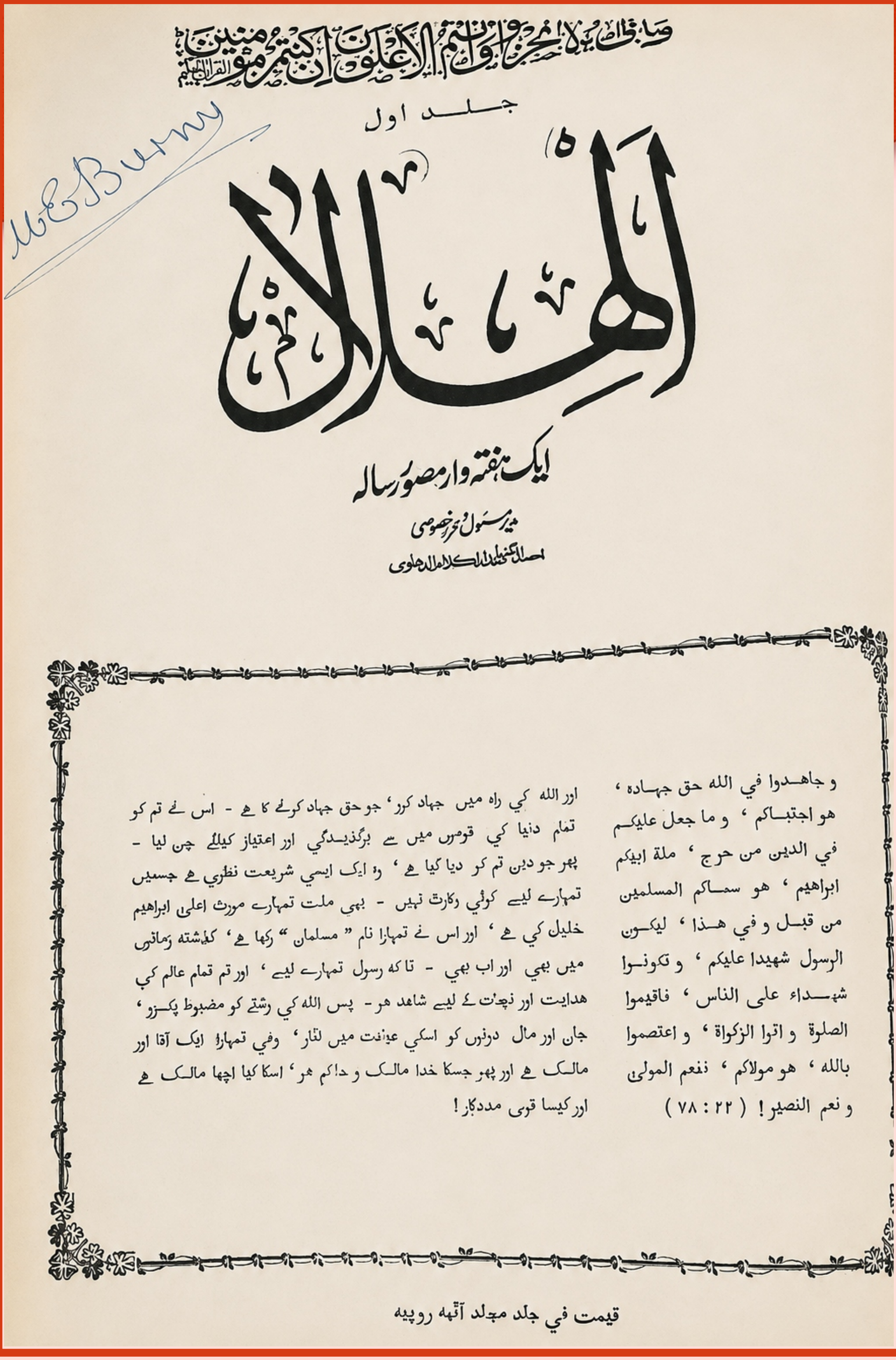
ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مؤمنين (القرآن الحكيم)

جلد اول

الہلال

ایک ہفتہ وار مصور رسالہ

مدیر مسئول و محرر خصوصی

احمد المکنی بابی الکلام الدہلوی

و جاهدوا في الله حق جهاده ، هو اجتباكم ، و ما جعل عليكم في الدين من حرج ، ملة ابيكم ابراهيم ، هو سماكم المسلمين من قبل و في هذا ، ليكون الرسول شهيدا عليكم ، و تكونوا شهداء على الناس ، فاقيموا الصلوة و اتوا الزكواة ، و اعتصموا بالله ، هو مولاكم ، فنعم المولى و نعم النصير ! (٢٢ : ٧٨)

اور الله كي راه ميں جهاد كرو ، جو حق جهاد كرنے كا هے - اس نے تم كو تمام دنيا كي قوموں ميں سے برگذيدگي اور امتياز كيلئے چن ليا - پهر جو دين تم كو ديا گيا هے ، وه ايک ايسي شريعت نظري هے جسميں تمهارے ليے كوئي دقت نهيں - يهي ملت تمهارے مورث اعلى ابراهيم خليل كي هے ، اور اس نے تمهارا نام " مسلمان " ركها هے ، گذشته زمانوں ميں بهي اور اب بهي - تا كه رسول تمهارے ليے ، اور تم تمام عالم كي هدايت اور نجات كے ليے شاهد هو - پس الله كي رشتے كو مضبوط پكڑو ، جان اور مال دونوں كو اسكي عبادت ميں لٹاو ، وهي تمهارا ايک آقا اور مالک هے اور پهر جسكا خدا مالک و حاكم هو ، اسكا كيا اچها مالک هے اور كيسا قوى مددگار !

قيمت في جلد مجلد آٹهه روپيه

مولانا آزاد کے اخبار ''الہلال'' کی تصویر

ستون بنایا گیا۔

مولانا آزاد کی سرپرستی میں ایسے کئی قومی ادارے قائم ہوئے جنہوں نے ہندوستان کے ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں ساہتیہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی اور للت کلا اکادمی نمایاں ہیں۔

ان اداروں کے قیام کا مقصد ہندوستان کی مختلف زبانوں، فنونِ لطیفہ، موسیقی، تھیٹر، مصوری اور ادبی روایت کا تحفظ اور فروغ تھا۔ ان اداروں نے ملک کی ثقافتی ہم آہنگی کو مضبوط بنانے میں اہم خدمات انجام دیں۔

مولانا آزاد مذہبی رواداری کے عظیم داعی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے احترام کے ساتھ مل جل کر رہ سکتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ فرقہ واریت، مذہبی نفرت اور تعصب کی مخالفت کی۔

ان کی تقاریر میں انسانیت، اخوت، محبت، برداشت اور انصاف کا پیغام نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی یہی سوچ ہندوستان کی مشترکہ ثقافت کو مضبوط بنانے میں نہایت مؤثر ثابت ہوئی۔

جامع مسجد دہلی سمیت مختلف مقامات پر ان کے خطبات نے ہندوستانی مسلمانوں کو مایوسی سے نکال کر امید، اتحاد اور قومی ذمہ داری کا احساس دلایا۔ ان کی قیادت نے آزادی کی تحریک کو فکری اور تہذیبی استحکام عطا کیا۔

آج بھی مولانا آزاد کی فکر ہمیں اتحاد، رواداری، علم دوستی اور ثقافتی ہم آہنگی کا درس دیتی ہے۔ ان کی زندگی اس حقیقت کی روشن مثال ہے کہ مضبوط ثقافت اور اعلیٰ تعلیم ہی کسی قوم کی پائیدار ترقی اور قومی استحکام کی ضمانت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخِ ہند میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام ایک عظیم قومی رہنما، ثقافتی معمار اور فکری مصلح کے طور پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔

جامع مسجد، دہلی کا تاریخی خطبہ

(23 اکتوبر 1947ء)

یہ مولانا آزاد کی سب سے مشہور تقریر ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد جب دہلی اور دیگر علاقوں میں خوف و ہراس کا ماحول تھا اور بہت سے مسلمان ہجرت پر غور کر رہے تھے، اس وقت جامع مسجد، دہلی میں مولانا آزاد نے ایک تاریخی خطاب دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو حوصلہ، صبر اور اعتماد کا درس دیا اور اپنے وطن ہندوستان میں رہ کر اس کی تعمیر میں حصہ لینے کی تلقین کی۔

"یہ جامع مسجد کے بلند مینار تم سے پوچھ رہے ہیں کہ تم نے تاریخ کے صفحات کہاں گم کر دیے؟... یاد رکھو! تمہارے آباء و اجداد نے اس سرزمین کی تاریخ بنائی ہے، اس لیے مایوسی تمہارا شیوہ نہیں۔"

یہ خطاب آج بھی اردو خطابت کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

رام گڑھ کانگریس کا صدارتی خطاب

(1940ء)

1940ء میں کانگریس کے صدر کی حیثیت سے مولانا آزاد نے رام گڑھ کے اجلاس میں تاریخی تقریر کی۔ اس میں انہوں نے ہندوستان کی مکمل آزادی، قومی اتحاد اور ہندو مسلم یکجہتی پر زور دیا۔

کانگریس اجلاس، بمبئی (1942ء)

"بھارت چھوڑو تحریک" کے موقع پر مولانا آزاد نے اپنی تقریروں میں عوام کو آزادی کی جدوجہد جاری رکھنے کی تلقین کی۔ انہوں نے قربانی، استقامت اور اتحاد کو کامیابی کی بنیاد قرار دیا۔

مولانا آزاد نے کلکتہ میں متعدد عوامی اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کو سیاسی بیداری، تعلیم اور قومی خدمت کی طرف متوجہ کیا۔

آزادی کے بعد مولانا آزاد نے مختلف مواقع پر قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آزادی صرف سیاسی کامیابی نہیں بلکہ اس کے ساتھ قومی تعمیر، تعلیم، انصاف اور سماجی ہم آہنگی کی ذمہ داری بھی وابستہ ہے۔

انہوں نے فرمایا کہ نئی نسل کو علم، تحقیق، اخلاق اور قومی خدمت کو اپنا شعار بنانا چاہیے تاکہ ہندوستان ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

مولانا آزاد کی تقاریر تحریکِ آزادی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کی خطابت میں علم، حکمت، دینی بصیرت، حب الوطنی، قومی اتحاد اور انسان دوستی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

آج بھی ان کی تقاریر قومی یکجہتی، مذہبی رواداری اور جمہوری اقدار کی بہترین مثال سمجھی جاتی ہیں۔

REGD.NO.MH-BY/SOUTH - 392 Licence No.13

"البلاغ" اور "الہلال" چھاپنے والی مشین کوڑیوں کے مول

شرم! شرم! ہمدردانِ اردو اور حکومت

فیروز بخت احمد

مولانا ابوالکلام آزاد کا لیتھو پریس کباڑی میں لوہے کے بھاؤ یعنی فی کلو چار روپے کی قیمت پر بیچا جا رہا ہے۔ یہ وہی پریس ہے جس پر "البلاغ" اور "الہلال" کی طباعت ہوا کرتی تھی۔

آج کل یہ جامع مسجد میں واقع ماہنامہ "دین دنیا" کے آفس میں لگا ہوا ہے اس کو الگ کر کے تول کر بیچا جا رہا ہے۔

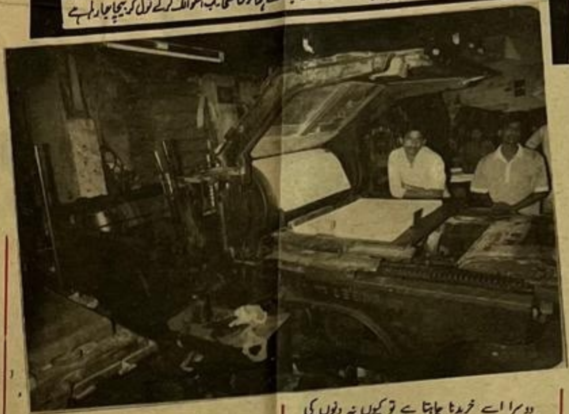

یہ وہی پریس ہے جس پر الہلال اور البلاغ کی طباعت ہوا کرتی تھی۔ اب اسکو الگ کر کے تول کر بیچا جا رہا ہے

"الہلال" کے دوسرے دفعہ اجراء اور بند ہونے کے بعد مولانا کو اپنا پریس فروخت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے اپنے رفیق جناب خواجہ حسن نظامی سے اس کا ذکر کیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ انہیں دنوں خواجہ صاحب کے شاگردوں میں ایک ہونہار نوجوان شوکت علی فہمی بھی ہوا کرتے تھے۔ جن کے بارے میں خواجہ صاحب کہا کرتے تھے' "میری تحریر پر مفتی شوکت علی فہمی کا نام ڈال دیا جائے یا شوکت علی فہمی کی تحریر پر میرا نام ڈال دیا جائے تو پڑھنے والا تفریق نہ کر پائے گا۔" شوکت صاحب انہیں دنوں دلی میں ایک پریس لگانا چاہتے تھے۔ جب خواجہ حسن نظامی نے دیکھا کہ ایک شخص تو پریس فروخت کرنا چاہتا ہے اور دوسرا اسے خریدنا چاہتا ہے تو کیوں نہ دونوں کی ملاقات کرادی جائے۔ لہٰذا خواجہ صاحب نے شوکت فہمی سے کہا "اگر مولانا آزاد کا پریس دیکھنا چاہتے ہو تو کل آجاؤ۔" دوسرے ہی روز فہمی صاحب اپنے برادر حقیقی جناب انوار ہاشمی کے ساتھ مولانا سے ملے اور انہیں کچھ رقم لفافہ کے اندر بند کر کے پیش کردی۔ رقم کتنی تھی' اس کا اندازہ نہ تو مولانا کو تھا اور نہ ہی بعد میں انہوں نے کسی پر یہ راز ظاہر کیا۔ اس کے دوسرے روز مولانا نے ہاتھ کی لکھی رسید شوکت فہمی صاحب کو دے دی۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ نہ ہی مولانا صاحب نے یہ کہا کہ فہمی صاحب نے کم رقم دی ہے اور نہ ہی فہمی صاحب نے یہ کہا کہ مولانا صاحب نے زیادہ رقم لی ہے۔ مگر جس طرح سے مولانا نے لفافہ کھولے بغیر رکھ لیا اور مشین اٹھانے کی اجازت دے دی اس سے لگتا تھا کہ ان کو پیسہ کی سخت ضرورت ہے۔ یہ بات دراصل آزادی سے بھی تقریباً پندرہ بیس سال قبل کی ہے جب مولانا عارضی طور پر دریا گنج میں حکیم عبدالحمید کے مکان پر رہ رہے تھے۔

اس مشین پر "الہلال" اس شان وشوکت سے نکلا اور آزاد کی زبان قلم سے نکلے ہوئے الفاظ کی تراکیب ندرت کی صداقت ایسی تھی کہ رسالہ نکلتے ہی ساری فضا پر چھا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی تعداد اشاعت ۳۰ ہزار تک پہنچ گئی جو اس سے قبل کسی اخبار کا مقدر نہ ہوئی تھی اور یہ اس حالت میں تھا کہ اس کا چندہ ۱۲ روپے تھا جو اس سے قبل کسی اور اخبار نے شاید ہی طلب کیا اور پایا ہو۔ حکیم عبدالحمید صاحب بتاتے ہیں کہ "الہلال" پر آزاد کی شخصیت کی پوری چھاپ ملتی ہے۔ دراصل یہ سارا معاملہ ایک شخص کی کارگزاری کا نتیجہ تھا۔ کاغذ اور فنڈ کی فراہمی سے لے کر چھپائی' مضامین' ملک اور بیرون ملک سے خبروں اور دیگر مواد کا حصول اور یہاں تک کہ لیتھو مشین کو اکثر چلانے کا کام مزدوروں کی غیر موجودگی میں بھی خود ہی کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا پریس سے باہر آئے تو تمام ہاتھ گریس اور تیل سے سنے ہوئے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی اسی وقت وہاں داخل ہو رہے تھے۔ آزاد کی حالت دیکھ کر معاجرہ سمجھ کر بولے' "گھبرایئے نہیں مولانا ہم یہ بات کسی کو نہیں بتائیں گے کہ آپ نے خود پریس چلایا۔ مولانا بھی مسکرا دیئے کیوں کہ شبلی نعمانی کو کم از کم اس بات کا تو پتہ نہیں چلا کہ وہ اس وقت لیتھو پریس میں سنگ سازی کا کام بھی نبٹا کر آرہے تھے۔ انہوں نے "الہلال" کے صفحات پر یہ واضح کردیا تھا کہ اس ہفتہ وار کو چلانے میں ان کی اپنی کوئی ذاتی یا تجارتی غرض شامل نہیں تھی۔ پرچہ جب شدید مالی مشکلات سے دوچار ہوتا تھا تب بھی وہ عطیات قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کی بیرونی امداد سے پرچے کی آزادی رائے پر چوٹ پڑے گی۔ یہ انہیں کی ہمت تھی کہ اتنے مالی خسارہ کے بعد بھی وہ اس پرچہ کو چلا رہے تھے۔ "الہلال" اردو کا پہلا باتصویر ہفتہ وار تھا۔ یہ مسلمانوں کے کسی مکتب خیال سے اتفاق نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔ "الہلال" کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کا پیغام تھا کہ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف متحد ہوں۔ انہوں نے واضح کیا کہ یہ ان کی ذاتی رائے نہیں بلکہ اسلام کا پیغام ہے جو ہر طرح کی ذہنی' سیاسی اور روحانی غلامی کو ترک کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

عام طور پر ایسا خیال کیا جاتا تھا کہ "الہلال" محض ایک سیاسی پرچہ ہے' مگر یہ درست نہیں تھا۔ اس میں جنگ' بلقان' طرابلس پہلو بہ پہلو غالب اور عمر خیام' فاطمہ بنت عبدالسلام اور محرم الحرام پر بھی اظہار خیال ہوتا تھا۔ ندوۃ العلماء اور مسلم یونیورسٹی کی بے راہ رویوں پر خالص سیاسی تبصروں میں بھی ایک ادبی

آگے صفحہ ۱۰ پر

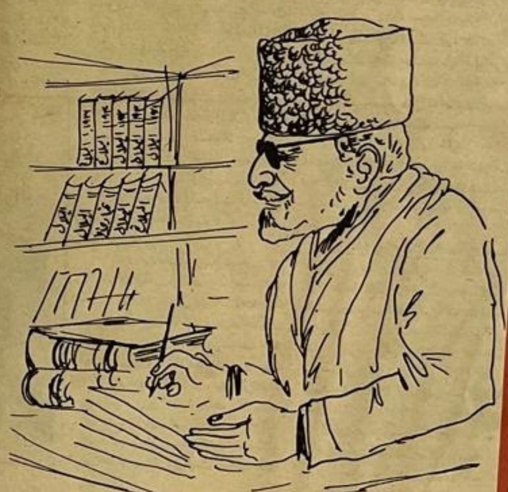

بلٹز

چیف ایڈیٹر
آر۔ کے۔ کرنجیا
گروپ ایگزیکٹیو ایڈیٹر
سدھیندر کلکرنی
ایگزیکیٹو ایڈیٹر
محمود ایوبی
ایڈیٹر
ہارون رشید علیگ

ہارون رشید علیگ نے انقلاب آفسیٹ پرنٹرز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۵۶۔ ڈی۔ جے دادا جی روڈ تاردیو ممبئی ۴۰۰۰۳۴ میں چھپوا کر بلٹز پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ کی طرف سے بیٹل ہاؤس ۱۷/۱۷ اکاؤس جی ہیٹل اسٹریٹ ممبئی سے شائع کیا۔
سرکولیشن 2047166۔ اشتہارات 2040720
ایڈیٹوریل 2047167-68

SAT.30 JULY 1994

ہفتہ وار اُردو بلٹز ۳۰ جولائی ۱۹۹٤ کا صفحہ ۱٦ جس میں مولانا آزاد کا لیتھو پریس اور البلاغ اور الہلال چھاپنے والی مشین کباڑ میں فروخت کی خبر تفصیل سے چھپی تھی۔

ڈاکٹر رفیعہ نوشین
(حیدرآباد، ہندوستان)

پندرہ اگست
اور
ایک عورت کے سوال

کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ آزادی کی تاریخیں بدل جاتی ہیں، مگر آزادی کی جدوجہد نہیں بدلتی۔
صرف اس کے میدان بدل جاتے ہیں، اس کے دشمن بدل جاتے ہیں، اس کی زنجیروں کی شکل بدل جاتی ہے۔
سوچتی ہوں...
کیا ہم وہ اختیار پا سکیں گے جس کے ہم واقعی حقدار ہیں؟

عزیزم خوشتر!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعا ہے کہ تم اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ بہ خیر و عافیت ہوگی۔ مدت ہوئی تم سے کوئی طویل بات نہ ہو سکی۔ زندگی کی مصروف راہوں نے شاید ہم سب کے درمیان خاموشیوں کے کچھ فاصلے رکھ دیے ہیں، مگر بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جن پر وقت کی گرد نہیں بیٹھتی۔ تمہاری یاد بھی انہی رشتوں میں شامل ہے۔

اِن دنوں اگست کی آمد نے ایک بار پھر فضا میں ترنگے کے رنگ بکھیر دیے ہیں۔ جانتی ہوں، مجھے یقین ہے کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی تم یومِ آزادی کی تقریبات کی تیاری میں مگن ہوگی۔ اپنے اسکول کے ننھے منے بچوں کو قومی نغمے یاد کرا رہی ہوگی، تقاریر کی مشق کروا رہی ہوگی، کسی کے ہاتھ میں ترنگا ہوگا، کوئی بھارت ماتا کی تصویر بنائے گا، تو کوئی آزادی کے متوالوں کا کردار ادا کر رہا ہوگا۔ ایک صدر مدرس کی حیثیت سے یہ منظر یقیناً تمہارے لیے باعثِ مسرت بھی ہوگا اور باعثِ فخر بھی۔

واقعی یہ قومی تہوار ہم سب کے لیے کس قدر اہمیت رکھتا ہے نا؟ اس لیے کہ اس کی بنیاد ایک ایسے لفظ پر ہے جو صدیوں سے انسان کے خوابوں کا محور رہا ہے... آزادی۔

مگر خوشتر!

ہر برس جب پندرہ اگست قریب آتا ہے تو میرے اندر ایک اور سوال جنم لیتا ہے۔ ایک ایسا سوال جو شاید قومی ترانوں کی آواز میں دب تو جاتا ہے، مگر خاموش نہیں ہوتا۔

ہم عورتیں بھی تو برسوں سے مختلف تحریکوں، جلسوں اور مباحث میں یہی نعرہ بلند کرتی آئی ہیں:

ہم لے کے رہیں گے... آزادی۔

بھید بھاؤ سے... آزادی۔

پڑھنے لکھنے کی... آزادی۔

اپنی شناخت کے ساتھ جینے کی... آزادی۔

لیکن پھر دل نہ جانے کیوں ٹھہر کر خود سے پوچھتا ہے...

کیا ہم عورتیں واقعی آزاد ہیں؟

ہاں، ہمیں آئین نے مساوی حقوق عطا کیے ہیں۔ ہم تعلیم حاصل کرتی ہیں، ملازمت کرتی ہیں، عدالتوں میں انصاف مانگتی ہیں، پارلیمان تک پہنچتی ہیں، ہواؤں میں جہاز اڑاتی ہیں اور خلاء تک سفر کرتی ہیں۔

مگر کیا آزادی صرف کامیابیوں کے یہ چند روشن استعارے ہیں؟

کیا ایک عام عورت، جو کسی چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہے، یا کسی تنگ گلی کے مختصر سے مکان میں اپنی زندگی بسر کر رہی ہے، وہ بھی اسی آزادی کی سانس لے رہی ہے جس کا جشن ہر سال منایا جاتا ہے؟

کیا اس کی آواز واقعی سنی جاتی ہے؟

کیا اس کے خواب اس کے اپنے ہوتے ہیں؟

کیا اس کے فیصلوں پر صرف اسی کا اختیار ہے؟ اور اگر ان سوالوں کے جواب نفی میں ہیں، تو پھر کیا ہماری آزادی ابھی ادھوری نہیں؟

پھر ایک اور سوال دل میں کانٹے کی طرح چبھتا ہے۔

کیا ہماری بیٹیاں واقعی بے خوف ہو کر اسکول، کالج، بازار یا اپنے کام کی جگہ تک جا سکتی ہیں؟

اگر نہیں، تو پھر آزادی کا جشن ہمارے ضمیر سے یہی سوال کرتا ہے:

کیا ہر ماں اپنی بیٹی کو گھر سے رخصت کرتے وقت مطمئن رہتی ہے، یا اس کی دعا میں ہر روز ایک انجانا خوف شامل رہتا ہے؟ آخر کیوں ہر شام کسی لڑکی کی واپسی تک ایک گھر کی سانسیں معلق رہتی ہیں؟

سوچتی ہوں، آزادی صرف پرچم لہرانے یا قومی ترانے گانے کا نام تو نہیں۔ آزادی تو یہ بھی ہے کہ ایک لڑکی اپنی عزت، اپنی حرمت اور اپنی جان کے تحفظ کے یقین کے ساتھ جینے کا حق رکھے۔ اگر اسے ہر قدم پر اپنے لباس، اپنی آواز، اپنے خواب اور اپنی موجودگی کا جواز دینا پڑے، اگر خوف اس کا مستقل ہم سفر بن جائے، تو پھر آزادی کا مفہوم ادھورا محسوس ہوتا ہے۔

خوشتر! آزادی کا سوال صرف عورت تک محدود نہیں رہتا، کبھی کبھی یہی سوال شہری کی شناخت اور اس کے وجود سے بھی جا ٹکراتا ہے۔

میں سوچتی ہوں کہ ہم اپنے وطن کی آزادی کا جشن کس کیفیت کے ساتھ منائیں؟ اس سرزمین سے محبت تو ہماری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے۔ اسی مٹی میں ہمارے آباؤ اجداد آسودۂ خاک ہیں، اسی وطن کی آزادی کے لیے ہمارے اسلاف نے اپنا خون، اپنی قربانیاں اور اپنی زندگیاں نچھاور کیں۔

مگر جب کبھی اسی وطن کے کچھ شہریوں سے ان کی حب الوطنی کا ثبوت مانگا جاتا ہے، جب ان کے وجود، ان کی وابستگی یا ان کی شناخت پر سوالیہ نشان کھڑے کیے جاتے ہیں، تو دل عجیب سی کسک سے بھر جاتا ہے۔

کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ماں، اپنے بطن سے جنم دینے کے بعد، اپنے ہی بچے سے اس کی پیدائش کا ثبوت طلب کر رہی ہو۔

وطن بھی تو ماں کی طرح ہوتا ہے۔ ماں اپنی اولاد کی محبت پر دلیل نہیں مانگتی، اور اولاد بھی ماں سے اپنی نسبت ثابت نہیں کرتی۔ ان دونوں کے درمیان صرف رشتہ ہوتا ہے، اعتماد ہوتا ہے، اپنائیت ہوتی ہے۔

میری خواہش ہے کہ ہمارا ہندوستان بھی ایسا ہی ہو؛ جہاں کسی کو اپنی وفاداری، اپنی ہندوستانیت یا اپنے وجود کا ثبوت نہ دینا پڑے، جہاں ہر شہری، خواہ وہ کسی بھی مذہب، زبان یا ثقافت سے تعلق رکھتا ہو، خود کو اس وطن کا برابر کا فرزند محسوس کرے۔ شاید اسی دن آزادی کا جشن اپنے حقیقی مفہوم میں مکمل ہوگا۔

کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ آزادی کی تاریخیں بدل جاتی ہیں، مگر آزادی کی جدوجہد نہیں بدلتی۔ صرف اس کے میدان بدل جاتے ہیں، اس کے دشمن بدل جاتے ہیں، اس کی زنجیروں کی شکل بدل جاتی ہے۔

سوچتی ہوں...

کیا ہم وہ اختیار پا سکیں گے جس کے ہم واقعی حقدار ہیں؟

یا پھر اس کے لیے بھی ہمیں ایک اور طویل سفر، ایک اور صبر آزما جدوجہد اور ایک اور خاموش جنگ لڑنی ہوگی؟

تم تو نئی نسل کی معمار ہو۔ ہر روز معصوم ذہنوں میں مستقبل کے چراغ روشن کرتی ہو۔ تمہاری کلاسوں میں بیٹھنے والی بچیاں کل کی ڈاکٹر، استاد، شاعرہ، سائنس دان اور قائد بنیں گی۔ اس لیے تمہاری رائے میرے لیے محض ایک دوست کی رائے نہیں، بلکہ ایک معلمہ اور ایک باشعور شہری کی آواز بھی ہے۔

بتاؤ خوشتر!

تمہاری نگاہ میں بے خوف زندگی کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اور کیا آزاد ہندوستان کی عورت واقعی آزاد ہے، یا وہ ابھی اس منزل کی مسافر ہے جس کا راستہ بہت طویل ہے؟

تمہارے جواب کا انتظار رہے گا۔

شاید تمہارا جواب میرے کئی سوالوں کو نئی سمت دے، کیونکہ مکالمہ ہی زندہ معاشروں کی پہلی علامت ہے۔

اللہ تمہیں سلامت رکھے، تمہارے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے اور تمہارے ہاتھوں سے نئی نسل کو ایک ایسا ہندوستان نصیب ہو جہاں آزادی صرف قومی ترانے کا لفظ نہ ہو بلکہ ہر انسان، خصوصاً ہر عورت کی روزمرہ زندگی کی حقیقت بن جائے۔

تمہاری مخلص دوست،

رفیعہ نوشین

فرخندہ ضمیر
(اجمیر، ہندوستان)

بیداریٔ آزادی کے نقیب

اُردو اخبارات

کئی دن سے واٹس ایپ، فیس بک پر یومِ آزادی کے متعلق آگاہ کیا جا رہا تھا۔ جبّار صاحب ماضی میں کھو گئے۔

پہلے بچّوں کی تیاریاں اپنے عروج پر ہوتی تھیں۔ اسکولوں میں آزادی کے نغمہ گانے کی پریکٹس ہو رہی ہوتی۔ تقریریں سکھائی جاتیں۔

آزادی کے ہیرو کے کرداروں کو پیش کرنے کے لئے کپڑوں کا انتخاب ہوتا، کوئی گاندھی بنتا تو کوئی پنڈت نہرو بنتا، کوئی ابوالکلام آزاد کے گیٹ اپ میں نظر آتا، تو کوئی سردار پٹیل بنتا۔ کپڑوں کے انتخاب میں کئی دن لگ جاتے۔

گھر میں بھی رونق رہتی ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری کو بچے صبح سویرے تیار ہوتے۔ میدان میں ڈرل اور پی ٹی کی ڈریس میں ایسے لگتے جیسے آسمان سے فرشتہ اتر آئے ہوں۔ ہر سو رنگ و نور کا سیلاب نظر آتا، ہر چہرہ مسرّت سے چمکتا ہوا، دمکتا ہوا۔

گھر کے بڑے اور بچے ٹی۔ وی کے سامنے بیٹھ جاتے وزیرِ اعظم کی تقریر اور سلامی پریڈ کی تقریب دیکھنے۔ بڑے بڑے ٹینک، میزائل، طیّارے، فوج کا خوبصورت ڈریس میں مارچ پاسٹ اور پھر ایک خوبصورت گاڑی میں بہادر بچے نظر آتے، آزادی کے متوالوں کے کارنامے بیان کئے جاتے تو ہر بچہ کے دل میں بہادری کا جذبہ پیدا ہوتا۔ لیکن اب بچّوں اور بڑوں میں وہ جوش و خروش ہے اور نہ وہ حبّ الوطنی کا جذبہ۔ بچے موبائل کے غلام ہو گئے، مغربی ممالک کے گیم اور کارٹون میں مصروف۔ آزادی کتنی قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی، آج کے دور کی نسل کو اس بات کا احساس نہیں۔

جبّار صاحب ہر ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری کو بچوں کی پسند کا بہت سارا ناشتہ لیکر آتے تھے۔

بچے اپنے موبائل پر کوئی گیم کھیل رہے تھے کہ جبّار صاحب کی آواز آئی:

”بچوں دیکھو میں تمھارے لئے کیا لایا ہوں۔“

بچے انکے ہاتھ میں لفافہ دیکھ کر سمجھ گئے کہ ابّو ناشتہ لائے ہیں۔ کچوری، سموسے، جلیبی۔

امی نے کھانے کی میز پر پلیٹس لگا دیں۔ بچے خوشی خوشی کھانے لگے۔

جنابِ آر صاحب نے کہا:

"بچوں آج میں تم کو آزادی کے متوالے ایک ایسے جاں باز کی کہانی سناؤں گا جنھوں نے آزادی کی خاطر جان قربان کر دی۔ بچوں تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ عوام میں آزادی کی بیداری پیدا کرنے میں اردو اخبارات کا بہت اہم رول رہا ہے۔ ان اردو اخبارات نے انگریزی حکومت کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ جیسے حسرت موہانی کا اخبار "اردوئے معلّیٰ"، مولانا آزاد کے اخبار "الہلال" و "البلاغ"، منشی فیاّض علی کا اخبار "زمیندار" وغیرہ۔ لیکن ان سب سے پہلے "دہلی اخبار" نے انگریزوں کے خلاف لکھنا شروع کیا اسکے ایڈیٹر مولانا محمّد حسین آزاد کے والد محمّد باقر تھے۔ اور وہی پہلے صحافی ہیں جنھیں انگریزوں نے پھانسی پر لٹکایا۔ یعنی وہ عظیم مردِ مجاہد جس نے شہادت کو قبول کیا لیکن انگریزی سرکار کے سامنے سرخم نہیں کیا۔

یہ آزادی بہت مشکل سے حاصل ہوئی ہے۔ ہندو مسلمان دونوں نے کندھے سے کندھا ملا کر ملک کو آزاد کرانے میں اہم رول ادا کیا ہے اور اپنی جانوں کی قربانی دے کر یہ آزادی حاصل کی ہے۔"

بچے یہ سن کر بہت متاثر ہوئے۔

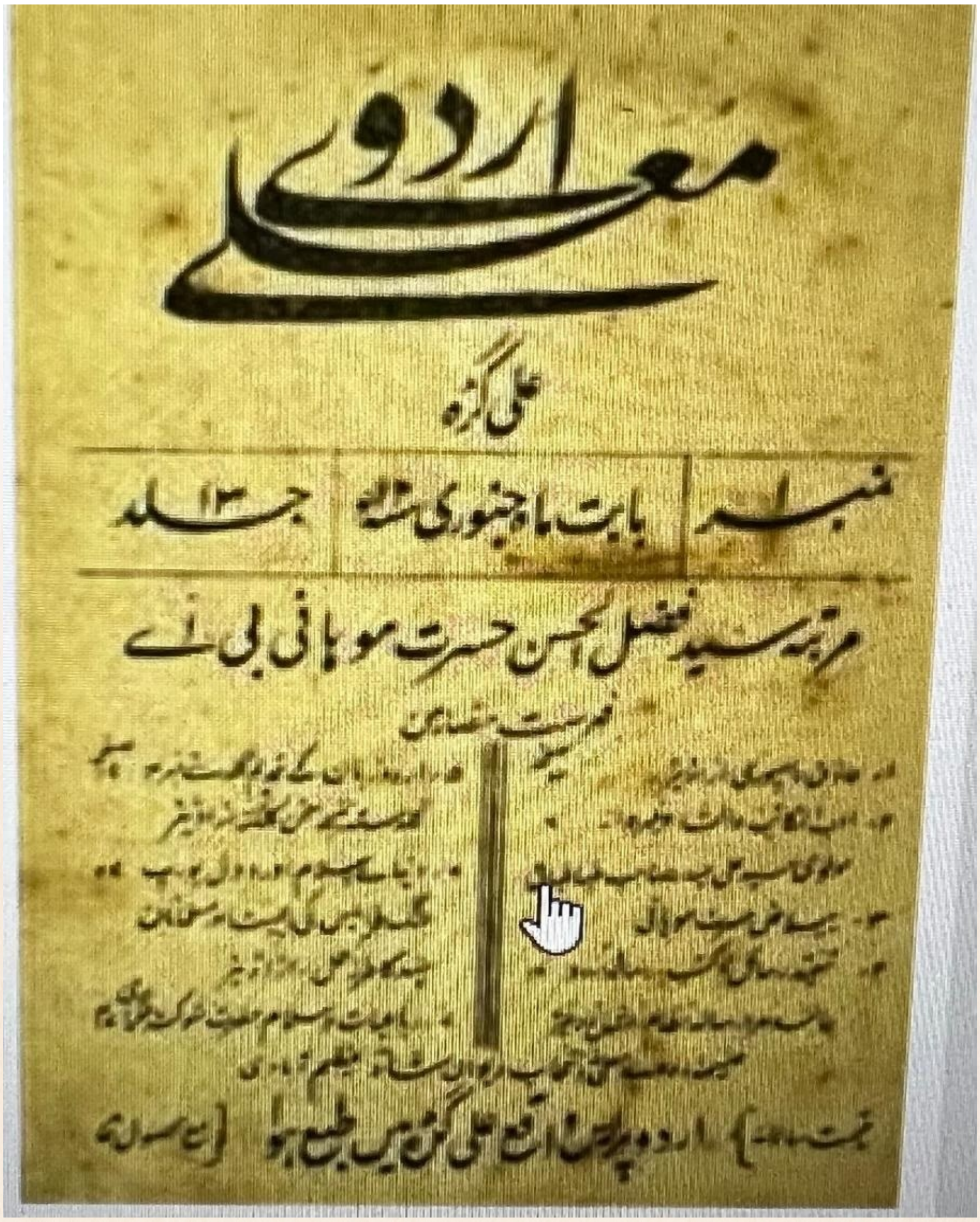

اردوے معلی

علی گڑھ

نمبر | بابت ماہ جنوری | جلد

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے

فہرست مضامین

اردو پریس ... علی گڑھ میں طبع ہوا

اخبار ''اُردوئے معلیٰ'' کی تصویر

مولانا حامد الانصاری (شیروانی میں)، مدیر اول اخبار مدینہ، بجنور، کی تصویر

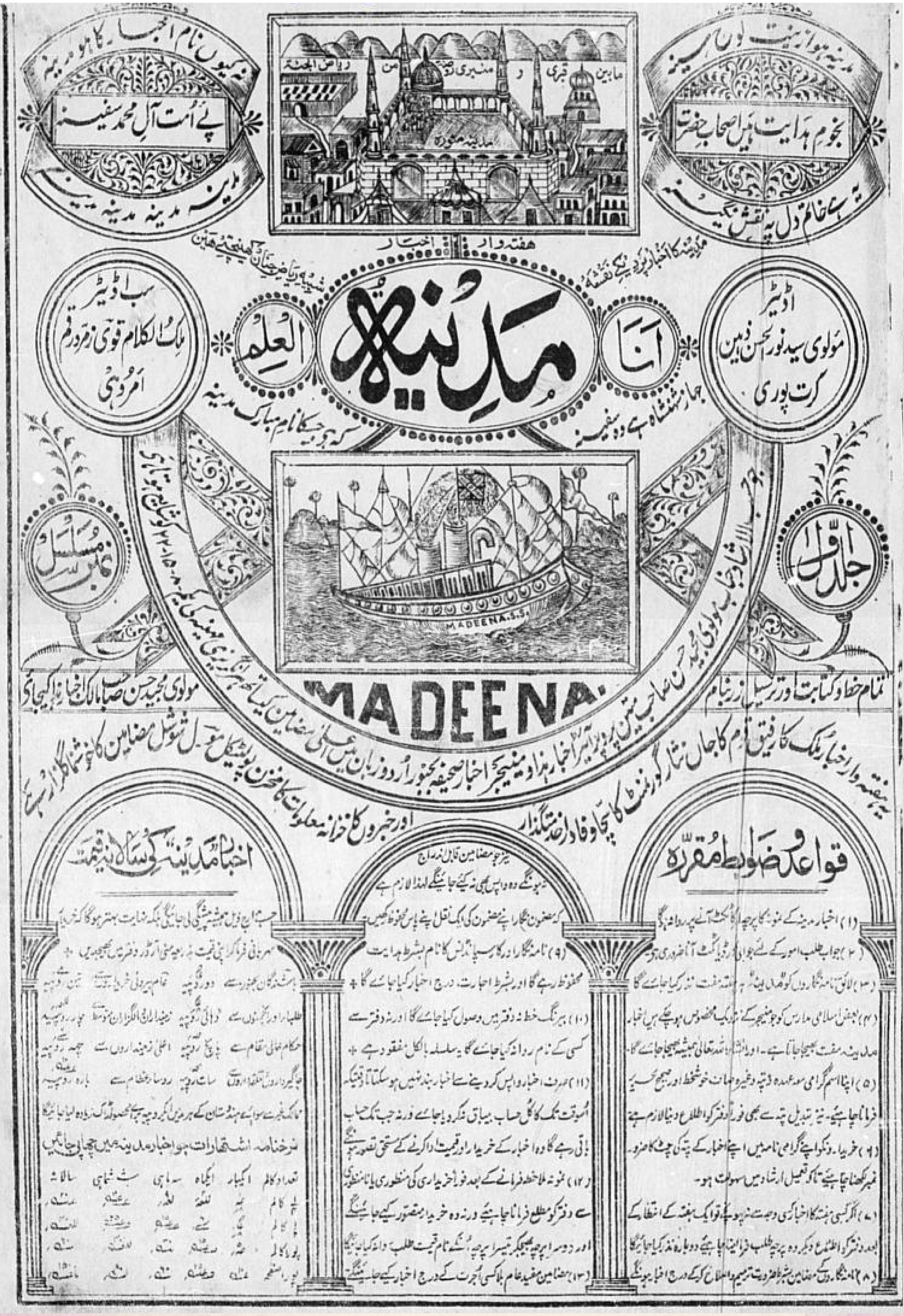

نہ کیوں نام اخبار کا ہو مدینہ
پئے اُمت آلِ محمد سفینہ
مدینہ مدینہ مدینہ مدینہ

مدینہ ہوا زینت لوحِ سینہ
نجومِ ہدایت ہیں اصحابِ حضرت
یہ ہے خاتمِ دل پہ نقشِ نگینہ

مابین قبری و منبری روضۃ من ریاض الجنۃ
مدینہ منورہ

ہفتہ وار اخبار

مدینہ

انا مدینۃ العلم

سب اڈیٹر
ملک الکلام قومی زمزمہ رقم
امروہی

اڈیٹر
مولوی سید نور الحسن ذہین
کرت پوری

جہاز شہنشاہ ہے وہ سفینہ
کہ ہے جسکا نام مبارک مدینہ

نمبر مسلسل

جلد اول

MADEENA.S.S.

MADEENA

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر بنام مولوی مجید حسن صاحب مالک اخبار

یہ ہفتہ وار اخبار ملک کا رفیق قوم کا جاں نثار گورنمنٹ کا سچا وفادار خدمتگذار پولیٹیکل سوشل مضامین کا مخزن معلومات کا خزانہ اور خبروں کا خزانہ

قواعد و ضوابط مقررہ

(۱) اخبار مدینہ کے نمونہ کا پرچہ ۱/ کا ٹکٹ آنے پر روانہ ہوگا
(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے
(۳) لائق مضمون نگاروں کو اخبار مدینہ مفت نذر کیا جائے گا
(۴) بعض اسلامی مدارس کو جو مینیجر کے نزدیک مخصوص ہو چکے ہیں اخبار مدینہ مفت بھیجا جاتا ہے۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ ہمیشہ بھیجا جائے گا۔
(۵) اپنا اسم گرامی مع عہدہ و پتہ وغیرہ صاف خوشخط اور صحیح تحریر فرمانا چاہئے۔ نیز تبدیل پتہ سے بھی فوراً دفتر کو اطلاع دینا لازم ہے
(۶) خریداروں کو اپنے گرامی ناموں میں اپنے اخبار کے پتہ کی چٹ کا نمبر لکھنا چاہئے تاکہ تعمیل ارشاد میں سہولت ہو۔
(۷) اگر کسی ہفتہ کا اخبار کسی وجہ سے نہ پہونچے تو ایک ہفتہ کے انتظار کے بعد دفتر کو اطلاع دیکر وہ پرچہ طلب فرما لینا چاہئے دوبارہ نذر کیا جائیگا
(۸) نامہ نگاروں کے مضامین بشرط ضرورت ترمیم و اصلاح کرکے درج اخبار ہونگے نیز جو مضامین قابل اندراج نہ ہونگے وہ واپس بھی نہ کئے جائینگے لہذا لازم ہے کہ مضمون نگار اپنے مضمون کی ایک نقل اپنے پاس محفوظ رکھیں
(۹) نامہ نگار اور کارسپانڈنس کا نام بشرط ہدایت محفوظ رہے گا اور بشرط اجازت درج اخبار کیا جائے گا +
(۱۰) بیرنگ خط نہ دفتر میں وصول کیا جائے گا اور نہ دفتر سے کسی کے نام روانہ کیا جائے گا یہ سلسلہ بالکل مفقود ہے +
(۱۱) صرف اخبار واپس کر دینے سے اخبار بند نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اُس وقت تک کا کل حساب بیباق نہ کر دیا جائے ورنہ جب تک حساب باقی رہے گا وہ اخبار کے خریدار اور قیمت ادا کرنے کے مستحق تصور ہونگے
(۱۲) نمونہ ملاحظہ فرمانے کے بعد فوراً خریداری کی منظوری یا نامنظوری سے دفتر کو مطلع فرمانا چاہئے ورنہ وہ خریدار متصور کیے جائینگے اور دوسرا پرچہ بھیجکر تیسرا پرچہ اُنکے نام قیمت طلب وی پی روانہ کیا جائیگا
(۱۳) مضامین مفید عام بلا کسی اجرت کے درج اخبار کیے جاسکینگے

اخبار مدینہ کی سالانہ قیمت

حسب ذیل ہمیشہ پیشگی لی جائیگی بلکہ نہایت بہتر ہوگا کہ خریدار صاحبان اپنی قیمت بذریعہ منی آرڈر دفتر میں بھیجدیں +

باشندگان بجنور سے	دو روپیہ	تمام بیرونی خریداروں سے	تین روپیہ
طلباء اور انجمنوں سے	ڈھائی روپیہ	رئیسان و الگزاران متوسط	چار روپیہ
حکام عالی مقام سے	پانچ روپیہ	اعلیٰ زمینداروں سے	چھ روپیہ
جاگیرداروں تعلقداروں سے	سات روپیہ	رؤسائے عظام سے	بارہ روپیہ

ممالک غیر سے سوائے ہندوستان کے ہر مد میں محصول ڈاک زیادہ لیا جائیگا

نرخنامہ اشتہارات جو اخبار مدینہ میں چھاپے جائیں

تعداد کالم	ایکبار	ایکماہ	سہ ماہی	ششماہی	سالانہ
¼ کالم	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
½ کالم	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
پورا کالم	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
پورا صفحہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

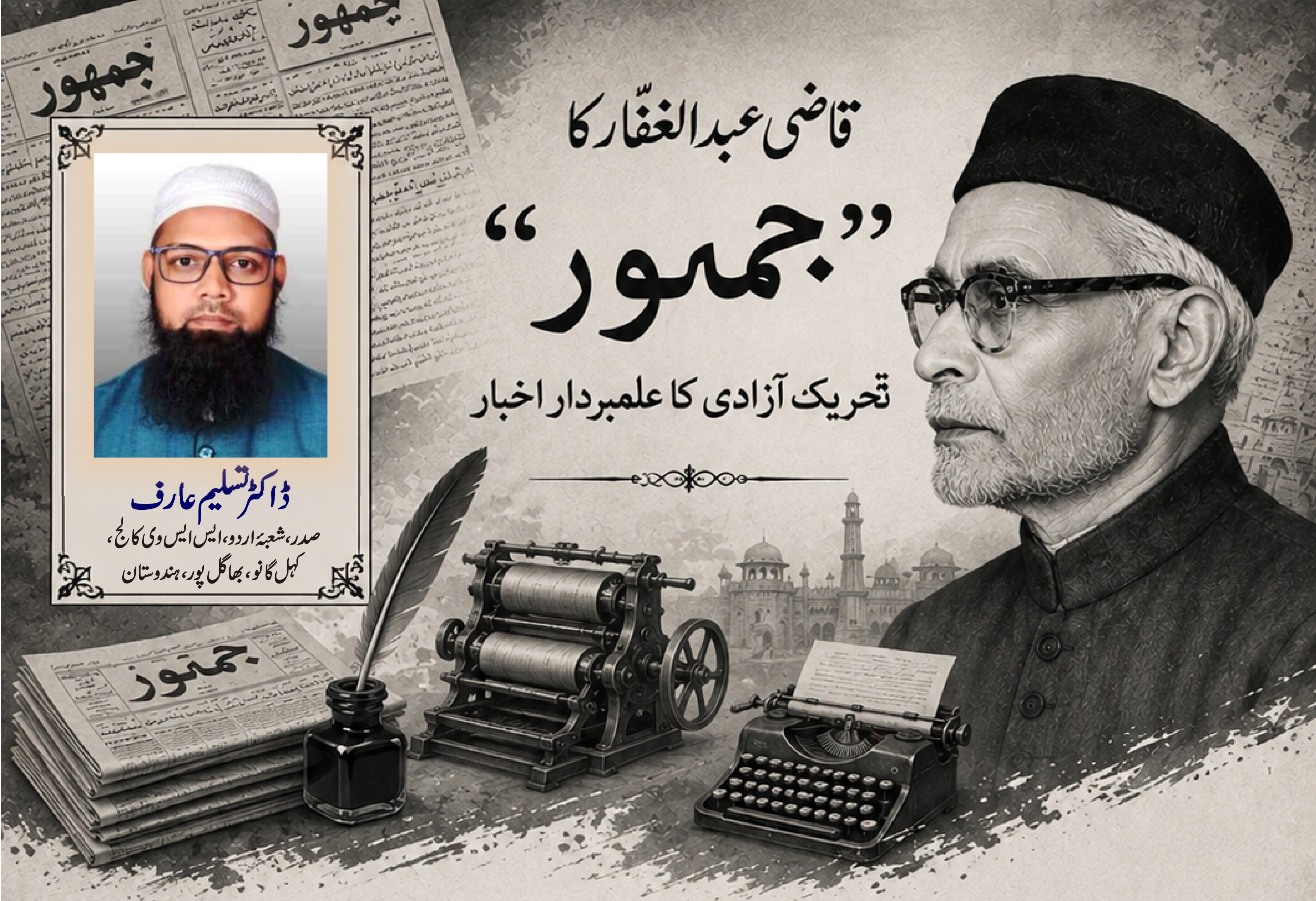

قاضی عبدالغفّار کا
”جمہور“
تحریک آزادی کا علمبردار اخبار

ڈاکٹر تسلیم عارف
صدر، شعبۂ اردو، ایس ایس وی کالج،
کہل گانو، بھاگل پور، ہندوستان

اُردو صحافت اپنے ابتدائی دور سے ہی اپنے انقلابی مزاج کے لیے جانی جاتی ہے اور صوبۂ بنگال خاص طور پر کلکتہ اس کی ”جنم بھومی“ اور ”کرم بھومی“ دونوں رہے ہیں۔ ۱۸۲۲ء میں اردو صحافت کی ابتدا اِسی سرزمین سے ہوئی اور بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسے قدآور صحافی اور مجاہدِ آزادی نے ”الہلال“ اور ”البلاغ“ جیسے مشہورِ زمانہ اخبارات بھی اسی خطے سے جاری کیے۔ ان اخبارات کو اپنی بے باکی اور حکومت کی آنکھ سے آنکھ ملانے کے حوصلے کی وجہ سے برٹش حکومت کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن ان اخبارات نے ہندستانیوں کے دل میں جو چنگاری پیدا کی اس کی وجہ سے بعد میں بھی کئی اخبارات و رسائل اس کی اتبّاع میں جاری کیے گئے جن کے تیور ”الہلال“ و ”البلاغ“ جیسے ہی تھے۔ انھی میں سے ایک اخبار ”جمہور“ بھی تھا جو اپنی باغیانہ خصوصیات اور کج کلاہی کی بنا پر بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے صفِ دوم کے اخبارات میں سب سے نمایاں قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ نکلنے والے اہم اخبارات میں ”ہم دم“ (لکھنؤ) اور ”مدینہ اخبار“ (بجنور) بھی اہم ہیں جنھوں نے ”کامریڈ“ و ”ہم درد“ (مولانا محمد علی جوہر)، ”الہلال“ و ”البلاغ“ (ابوالکلام آزاد)، ”اردوے معلا“ (حسرت موہانی) اور ”زمین دار“ (ظفر علی خاں) جیسے صفِ اول کے اخبارات کے معیار کے مطابق بیسویں صدی کے اخبارات کی دوسری صف آراستہ کی۔ ان اخبارات میں ”جمہور“ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ بہت ہی کم مدّت میں اس نے ایک وسیع حلقے تک رسائی حاصل کی اور ایک قلیل مدت میں ہی اپنے اندازِ تخاطب اور جرأتِ رندانہ سے انگریزی حکومت سے زبردست لوہا لیا اور برٹش حکومت نے اس کے باغیانہ تیور سے تلملا

کر محض نو ماہ کے قلیل عرصے میں اسے بند کرا دیا۔

اردو اخبارات کے سلسلے سے جتنی کتابیں لکھی گئیں یا جو تحقیقیں ہوئیں، ان میں جمہور اخبار کا ذکر کم کم یا پھر معدوم نظر آتا ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں نکلنے والے اخبارات اور برطانوی حکومت کے ظلم و تشدّد سے ٹکرانے والے اخبارات میں اسے ایک

''انڈر ریٹیڈ'' (rated-under) اخبار مانا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی رہی کہ اس اخبار کی کوئی فائل ہندستان کی کسی لائبریری میں دستیاب نہیں اور شانتی رنجن بھٹا چاریہ جنھوں نے اس اخبار کے تعلق سے بنیادی کام کیا تھا انھیں بھی اس کے کسی شمارے کا بہ نفسِ نفیس دیدار تک نصیب نہیں ہوا۔ کیوں کہ جب 1918ء میں سرکار کے حکم سے یہ اخبار ضبط کیا گیا تو اس کے سارے شمارے بھی ضایع کر دیے گئے تھے۔ اخبار کے مدیر قاضی عبدالغفار نے بعد میں حیدر آباد کے ایک خریدار سے یہ اخبار قیمتاً حاصل کیا۔

اس اخبار کے سلسلے سے سب سے جامع اور مستند کام کرنے والی پروفیسر عابدہ سمیع الدین صاحبہ نے کافی تلاش و جستجو کے بعد قاضی عبدالغفار صاحب کی اہلیہ اور بیٹی کی وساطت سے اس اخبار تک رسائی حاصل کی۔ بعد میں انھوں نے اس اخبار پر دل جمعی سے کام کیا اور اخبار کے اداریوں کا انتخاب کیا اور اپنے مقدّمے کے ساتھ ''اخبار جمہور: برطانوی آمریت و استبداد سے ٹکراؤ (تجزیہ و انتخاب)'' کے عنوان سے ٤١٦ صفحات کی ضخیم کتاب شایع کی۔

اس اخبار کے مالک مسعود احمد ولد عبدالعزیز اور مدیر قاضی عبدالغفار تھے۔ قاضی عبدالغفار (پیدایش:١٨٨٩ء ، وفات:١٧/ جنوری ١٩٥٦ء) کی پیدایش مرادآباد میں ہوئی۔ ان کے دادا قاضی حامد علی جو کہ مرادآباد کے قاضی تھے، انھیں ١٨٥٧ء کے غدر میں انگریزوں نے ظلم کا شکار بنایا اور پھانسی پر لٹکا دیا۔ ان کے والد کا نام خان بہادر قاضی ابرار احمد تھا جو علم و ادب کا ذوق و شوق رکھتے تھے جس کے باعث وہ اپنے وطن مرادآباد میں درجۂ اول کے آنریری مجسٹریٹ بن گئے۔ قاضی عبدالغفار کی ابتدائی تعلیم مرادآباد میں ہوئی، میٹرک پاس کرنے کے بعد انھیں اعلی تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا جہاں سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ کی تعلیم مکمل کی۔ ان کے والد انگریزی سرکار میں مقبول تھے۔ انھوں نے کوشش کرکے قاضی صاحب کو نائب تحصیل دار کی ملازمت دلوادی پھر وہ اپنی محنت سے تحصیل دار بنے اور دو سال تک یہاں کام کیا، لیکن شروع سے ہی ان کی دل چسپی صحافت سے تھی۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز محض ١٦/ برس کی عمر میں ''نیّرِ عالم'' اخبار کے ذریعے سے کیا جو مرادآباد سے ابنِ علی صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ وطن پرست خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قوم اور ملت کی محبت ان کی رگوں میں دوڑتی تھی۔ اس کے علاوہ زبان و بیان پر بھی انھیں اچھّی قدرت حاصل تھی۔ لہٰذا جب ان کی صلاحیتوں کا علم مولانا محمد علی جوہر جیسی شخصیت کو ہوا تو انھوں نے اپنے اخبار ''ہم درد'' میں 'نائب صدر' کے طور پر ان کا تقرّر کرلیا۔ ''ہم درد'' اخبار بھی اپنی وطن پرستی، بے باکی اور تحریکِ آزادی میں اپنے اہم کردار کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ''ہم درد'' کی مقبولیت اور معیار کا عالم یہ تھا کہ بڑے سے بڑا ادیب بھی ''ہم درد'' میں شایع ہونے کو باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ ایسے میں اس اخبار میں کام کرنے اور مولانا محمد علی جوہر کی تربیت نے قاضی صاحب کی صلاحیتوں کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ مولانا محمد علی سے قاضی صاحب نے وہ تمام گُر سیکھے جو اس فن لیے ضروری تھیں اور اسے معیاری بنانے میں معاون ثابت ہوتیں۔ مولانا محمد علی کی نظر بندی کے ساتھ یہ اخبار بند ہو گیا۔ یہ مولانا محمد علی کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ جب ''ہم درد'' اور اس کے بعد 'الہلال' و 'البلاغ'

جیسے اخبار پر برٹش حکومت کا عتاب نازل ہوا تو ابوالکلام آزاد کی محبت وعقیدت اور محمد علی جوہر کی ایما پر قاضی صاحب نے"جمہور" اخبار جاری کیا جس میں ہمیں مندرجہ بالا اخباروں کی اعلی صحافتی قدروں کی جھلک نظر آتی ہے۔

اس اخبار کے پہلے شمارے کی اشاعت کی تاریخ کا تعین کرتے ہوئے پروفیسر عابدہ سمیع الدین لکھتی ہیں:

''۷ ۱۹۱ء کو ایک ہزار روپے کی ضمانت داخل کرنے کے بعد ۲۱ ر دسمبر کو'جمہور' نکالنے کے لیے ڈکلیریشن ملا جس کا نمبر ۱۰۱ ر ہے۔ اجازت نامے کے بعد اس کا پہلا شمارہ دسمبر ۱۹۱۷ء کو منظرِ عام پر آیا۔''

قاضی عبدالغفار کے بارے میں ہم جانتے ہی ہیں کہ وہ"لیلا کے خطوط" اور"مجنوں کی ڈائری" جیسے ناولوں کے خالق ہیں۔ محمد علی جوہر کے وہ تربیت یافتہ تھے اور مولانا آزاد سے بھی ان کے قریبی تعلقات تھے۔ وہ گاندھی جی کے عقیدت مندوں میں تھے اس لیے کانگریس کی فکر وعمل کے حامی اور مسلم لیگی فکر سے خود کو علیحدہ رکھتے تھے۔ قاضی صاحب گاندھی جی کو ہندو مسلم اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا علم بردار سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ادارت میں" جمہور" اخبار تحریکِ آزادی کے سلسلے سے اپنی بساط بھر کوششیں کرتا نظر آتا ہے۔ بشمبر ناتھ پانڈے تحریکِ آزادی کے سلسلے سے"جمہور" کی کوششوں کے تعلق سے یوں رقم طراز ہیں:

" جمہور" نے اپنی مختصر سی اشاعت میں تحریکِ آزادی میں ہر ممکن معاونت کی، قومی یک جہتی کا پرچار کیا اور مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ کانگریس کو مضبوط بنائیں۔ قاضی جی کے مطابق"جمہور" ہندو و مسلمانوں کے متعلق جزئیات کی بحث کم چھیڑتا ہے۔ وہ ہندستان میں ایک متحد قومیت کا نہ صرف موئید بلکہ متمنی ہے۔"جمہور" کا طرزِ عمل ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جو رائی کا پہاڑ بنا کر مسلمانوں کے اندر ہم سایہ قوم کے خلاف اشتعال پیدا کر کے اپنا بازار گرم کر لیتے ہیں۔" جمہور'' نے ہمیشہ وطن پرستی، قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر زور دیا ہے۔"

" جمہور" کی اشاعت محض نو ماہ ہی ہو سکی لیکن اسی قلیل مدت میں اس نے قارئین کے درمیان اپنی منفرد شناخت قایم کر لی۔ اس میں ہمیں اُس عہد کے تناظر میں مختلف موضوعات پر قاضی صاحب اظہارِ خیال فرماتے نظر آتے ہیں۔ اہم قومی اور مذہبی شخصیات مثلاً گاندھی جی، حسرت موہانی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا محمودالحسن گنگوہی وغیرہ کے تعلق سے اداریے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملّی اور تعلیمی اداروں کے حالات ومسائل کا بھی قاضی صاحب باریک بینی سے اپنے اداریوں میں جائزہ لیتے ہیں۔ "کلکتہ یونی ورسٹی کمیشن"، "تعلیمی ہوم رول"، " ندوۃ العلما"، "علی گڑھ میں مسئلۂ اقتدار"، "تعمیمِ تعلیم"، " جامعہ اردو حیدر آباد" اور "علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن" وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت لکھے گئے اداریے اسی قبیل کے ہیں۔ مذہبی مسائل کے تعلق سے بھی یہاں اظہارِ خیال ملتا ہے۔ زکوۃ کے مسائل، تعدد ازدواج، رمضان کی تقدیس وغیرہ جیسے دیگر عنوانات اسی ذیل کے اداریوں کا حصہ بنتے ہیں۔

قاضی عبدالغفار کا مطالعہ کافی وسیع تھا اور دنیا میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات سے وہ اچھی واقفیت رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ" جمہور" اس اعتبار سے کسی تنگ نظری کا شکار نظر نہیں آتا۔ یہ اخبار صرف ملکی اور ملی مسائل تک ہی محدود نظر نہیں آتا بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی جو حالات پیدا ہو رہے تھے، ان کا نہ صرف اس میں تذکرہ ملتا ہے بلکہ ہندستان کی صورتِ حال سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے برطانوی سامراج کی دوغلی پالیسی بے نقاب کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ اس قبیل میں" ہندستان کے مطالبے اور برطانوی مزدور"، " ہندستان کے انتہا پسند اور انگلستان کے انتہا پسند"، " بغاوتِ آئرلینڈ اور اہلِ ہند" وغیرہ جیسے اداریے

پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں جن میں قاضی صاحب عالمی تناظر میں دلائل و براہین کی روشنی میں برٹش حکومت کے ظلم و جبر اور ہندستان اور انگلستان کی پالیسی میں دوہرا رویّہ اپنانے پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔

ہندستان میں انگریزی زبان میں شایع ہونے والے اس زمانے کے اخباروں پر بھی قاضی صاحب کی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان اخبارات میں جو موضوعات اور مضامین قابلِ گرفت ہوتے، ”جمہور“ میں ضرور ان کی گرفت ہوتی۔ ۲۴/اگست ۱۹۱۸ء کا اداریہ اس ضمن میں کافی اہم ہے جو ”حملہ در حملہ“ کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ دراصل اُس زمانے میں ”انڈین ڈیلی نیوز“ میں ایک مضمون شایع ہوا جس میں رسالت مآب ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخانہ باتیں لکھی گئی تھیں۔ اس پر اس وقت کے اردو اخباروں میں کافی ہنگامہ ہوا۔ لیکن الٹا ہندستانی اخباروں پر ”اندین ڈیلی نیوز“ نے مختلف قسم الزامات عائد کیے۔ اخبار کی اس حرکت پر قاضی صاحب نے اس اداریے میں برہمی کا اظہار فرمایا۔ اس مسئلے پر صفائی دیتے ہوئے ”انڈین ڈیلی نیوز“ نے جب متکبرانہ رویّہ اپنایا تو قاضی صاحب نے اسے فرعون اور نمرود تک کے رویے سے تشبیہہ دے ڈالی۔ ایک مسلم ہونے کی حیثیت سے بے شک یہ مسئلہ کافی سنگینی کا حامل تھا لیکن جس طرح قاضی صاحب نے علمی انداز میں اردو روزناموں پر عائد کردہ الزامات کا جواب دیا ہے، وہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔

قاضی صاحب کا اسلوبِ بیان بھی ”جمہور“ کی شان میں مزید اضافہ کرتا نظر آتا ہے۔ قاضی صاحب اپنے اداریوں میں اکثر اشعار سے ابتدا کرتے ہیں اور موضوع کی مناسبت سے موزوں ترین اشعار رقم کر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اداریوں میں قرآنِ کریم کی آیات کا بھی جگہ جگہ استعمال نظر آتا ہے۔ کچھ جگہ تو وہ ترجمہ پیش کرتے ہیں لیکن کچھ مقامات پر اس طرح آیات کا استعمال کرتے ہیں کہ وہ عبارت کا ہی حصہ معلوم ہوتا ہے اور بیان کی چاشنی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

☆ ”جب سمندر میں طوفان آتا ہے اور ہلاکت خیز موجیں کشتی کو پاش پاش کر دیتی ہیں تو اس وقت بدنصیب ڈوبنے والا ایک بوسیدہ تختہ کو بھی اپنی زندگی کا سہارا خیال کرتا ہے اور اس کے اعتماد کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ وہ اس تنکے کو بھی کشتیِ حیات خیال کرتا ہے جو اسی کی طرح سمندر کی موجوں میں بہا جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت اس بدنصیب قوم کے اعتماد کی ہو جاتی ہے جس کا جاہ و جلال سیلابِ تنزلی میں غرق ہو گیا ہو۔ جس کی کشتیِ حیات زمانہ کی موجوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی ہو اور جس کے جہاز کا لنگر ٹوٹ چکا ہے۔“

☆ ”ایک شخص کے سامنے جو برسوں سے فاقے کر رہا ہو ایک پر تکلف دسترخوان بچھا دیا جائے تو یہ سچ ہے کہ وہ لطیف غذاؤں کا فوراً متحمل نہ ہو سکے گا اور شاید کچھ عرصہ تک اس کی جھجک باقی رہے گی لیکن وہ کسی حال میں ان نعمتوں کو نعمت سمجھنے سے قاصر نہ ہوگا۔ اس لیے اگر کم و بیش ایک صدی تک دست نگری کی حالت میں رہنے کے بعد اہلِ ہند اپنے ملک کی حکومت میں حصہ لیتے ہوئے کسی قدر جھجکیں تو اس کے یہ ہرگز معنی نہیں کہ وہ ان سیاسی حقوق کی نوعیت سے واقف نہیں جن کا مطالبہ کیا جا رہا ہے یا وہ ان کی قدر نہ کر سکیں گے۔“

قاضی صاحب کے اسلوب میں یہ بات خصوصی توجہ کی حامل ہے کہ وہ اپنی تحریر کی روانی میں قرآن کی آیات کو جملوں میں استعمال کرتے چلے جاتے ہیں اور ان کے ترجمے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے الا ماشاء اللہ چند مقامات کو چھوڑ کر جہاں انھیں کوئی دینی مسئلہ سمجھانا ہو، وہاں البتہ ترجمہ پیش کرتے ہیں لیکن ان کا عمومی انداز یہی ہے کہ قرآن کی آیات بغیر ترجمے کے جملوں کا حصہ بناتے ہیں۔

”جمہور“ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ

اس میں قاضی عبدالغفّار اپنے ذوق کے مطابق اداریوں کا افتتاح تو اشعار کے ذریعے کرتے ہی ہیں ،جگہ جگہ قرآن کی آیات کا بھی استعمال اپنی بات کی تائید کے لیے یا اپنی بات کو موثّر بنانے کے لیے کرتے ہیں جن میں اردو اور فارسی کی قید نہیں۔ایسے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

سب کی ہے تمھی پہ نگاہ
تم مسیحا بنو خدا کے لیے

ایک یہ بزم ہے لے دے کے ہماری باقی
ہے اُنھی لوگوں کی ہمّت پہ بھروسا اپنا

اب تو اُٹھ سکتا نہیں آنکھوں سے بارِانتظار
کس طرح کاٹے کوئی لیل ونہارِ انتظار

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منھ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روٗ سیاہ تجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکا

باطل سے دبنے والے،اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبنم ،نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

ہست مجلس بران قرار کہ بود
ہست مطرب بران ترانہ ہنوز

یادگارِ ہزارِ رنگِ گل ست
خس و خاشاک آشیانۂ ما

یہ اور اس طرح کے کئی اشعار موضوع اور موقع محل مناسبت سے”جمہور“ کے اداریوں کا کثرت سے حصّہ بنتے ہیں۔قاضی صاحب اپنے اداریوں میں مکمل فارسی شعر کم استعمال کرتے ہیں لیکن اس کے بجائے فارسی کا ایک مصرعے کے استعمال کو وہ زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔کبھی کبھی ایک ہی اداریے میں تین تین اور چار چار کی تعداد میں اشعار پیش کرتے ہیں۔مصرعوں سے وہ اداریوں کا عنوان بھی بناتے ہیں اور ذیلی سرخیوں کے طور پر بھی مصرعوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ ۲۵ رمئی ۱۹۱۸ء کو دیوبند کے بزرگوں کا دفاع کرتے ہوئے انھوں نے عنوان بنایا ہے:”سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟“۔اسی طرح ہوم رول لیگ کے وفد کو کولمبو میں ہی روک دینے پر شدید غصّے کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے جو اداریہ رقم کیا ہے اس کا عنوان یہ تجویز کیا ہے:”زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہوکر“۔

قاضی صاحب اپنے اداریوں میں ایسی کاٹ دار زبان اور طنز کے نشتر برطانوی عدلیہ اور افسران پر برساتے ہیں کہ ان کے لرز کر رہ جانے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔ایسے اداریے ان کی بے باکی کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔میں بس ایک اداریہ”کالے آدمیوں کی بے وقوفی!“(مورخہ ۱۳ر مارچ ۱۹۱۸ء) سے اقتباس پیش کرنا چاہوں گا جس میں انھوں نے انگریزوں کے ذریعے معصوم ہندستانیوں کے قتل پر تبصرہ کیا ہے جس میں عدالت نے انصاف سے منھ موڑتے ہوئے ان حادثات کے وقوع ہونے کو”اتّفاقیہ“قرار دے دیا۔اسی کے پس منظر میں قاضی صاحب کا ردِّعمل ملاحظہ فرمائیں:

”کم بخت (ہندستانی)اس قدر احمق ہوتے ہیں کہ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ محل۔نہ کسی سے صلاح کرتے ہیں نہ مشورہ اور دفعتاً مر جاتے ہیں۔بھلا بتایئے تو کہ اگر سارجنٹ صاحب کا رائفل اتّفاقیہ طور پر چل بھی گیا تو ضلع دار صاحب کے ملازم کو فوراً مر جانے کی کیا ضرورت تھی۔اس قسم کی جماعتیں انتظامِ سلطنت میں حارج ہوتی ہیں۔عدالت نے فیصلہ کیا کہ رائفل اتّفاقیہ طور پر چل گیا اور ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ رائفل کے چل جانے کی

بحث ہی فضول ہے۔غلطی سراسر مرنے والے کی تھی کہ وہ کیوں بغیر اجازت مر گیا۔کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ سارجنٹ صاحب کا رائفل اگر اتفاقیہ طور پر چل گیا تھا تو کیا کارتوس بھی اتفاقیہ طور پر اس کے اندر پہنچ گیا اور کیا اس کی نال بھی محض اتفاقیہ طور پر ضلع دار صاحب کے ملازم کی طرف ہوگئی تھی۔رائے بہادر سلطان سنگھ کی آنکھ مع عینک کے کیوں اتفاقیہ طور پر صاحب کے گھونسلے کے سامنے آ گئی؟ مسٹر معظم علی کیوں اتفاقیہ طور پر وارنر صاحب کے سامنے آ گئے؟ ضلع دار کا نوکر کیوں اتفاقیہ طور پر سارجنٹ کے رائفل کی زد میں آ گیا؟ کالے آدمیوں سے اتفاقیہ طور پر جو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، ان کی وجہ سے صاحب لوگوں کو خواہ مخواہ دشواریاں پیش آتی ہیں۔''

برٹش حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے اور اپنے ہم وطنوں کے حقوق کے لیے آواز اُٹھانے کا یہ حتمی نتیجہ تھا کہ ''جمہور'' حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگا۔ماہرِ ابوالکلامیات ڈاکٹر جمشید قمر کے مطابق کلکتہ میں پہلی جنگِ عظیم کے اختتام سے قبل قاضی عبدالغفار نے جو ماحول بنایا اس سے کلکتہ میں ''بلوا'' واقع ہوا۔انگریزی حکومت نے اس واقعے کا نوٹس لیتے ہوئے قاضی صاحب پر تادیبی کارروائی کی۔''جمہور'' اخبار بند ہونے کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔آخر کار ۱۴؍ستمبر کو ڈفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت اس اخبار میں ہر خبر کی اشاعت کے لیے سنسر کی منظوری کو لازم کر دیا گیا اور قاضی صاحب کو کلکتہ سے خروج کا حکم دے کر اخبار کو بند کر دیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہندستانی صحافت کی تاریخ میں ایک امٹ نشان بن گیا۔یہ اخبار قاضی صاحب کے دل کے کتنا قریب تھا اس کا اندازہ ان کے اس جملے سے لگایا جاسکتا ہے:

''یادش بہ خیر 'جمہور' نے جب اپنے چہرے پر فنا کی نقاب ڈالی تو 'صباح' کی برقعہ کشائی نے اس کی تلافی کر دی۔اس لیے مجھے اطمینان ہے کہ اگر 'صباح' نے بھی اپنے برادرِ مرحوم کا ساتھ دیا تو پھر اسی 'جمہور' کی روح کسی اور روپ میں اپنی رونمائی سے باز نہیں رہے گی۔''

اس کے علاوہ قاضی صاحب کا بیان ہے کہ یہ ان کا سب سے کامیاب اخبار تھا جس کی تعداد اشاعت ۱۳۰۰۰؍ پہنچ چکی تھی۔صرف نو ماہ تک جاری رہنے والے اخبار کا اتنی تعداد میں لوگوں تک پہنچنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس اخبار کی مقبولیت کس درجے تک پہنچ چکی تھی۔افسوس کا مقام ہے کہ بیسویں صدی کے صفِ دوم کا سب سے اہم اخبار ہونے کے باوجود اس کا تذکرہ قاضی صاحب کی صحافت کا ذکر کرنے والوں نے بہت سرسری طور پر کیا ہے۔اب تو اردو صحافت کی دو صدیاں بھی مکمل ہو رہی ہے اور ''جمہور'' کی ایک صدی مکمل ہو چکی ہے۔ایسے میں اردو صحافت کی تاریخ سے فراموش کیے ہوئے اس اخبار کے تعلق سے کئی گوشوں کو اجاگر کیا جانا باقی ہے۔ہمیں امید ہے کہ مستقبل میں اس کی جانب خاطر خواہ توجہ کی جائے گی اور مختلف جہات سے ''جمہور'' اخبار نے ہندستانی صحافت کو کیا دِیا اور تحریکِ آزادی پر اس کا کیا اثر ہوا؟ اس حوالے سے مطالعے کو ہمارے ناقدین توجہ کا مرکز بنائیں گے اور ''ہم درد''، ''الہلال''، ''البلاغ'' یا اس دور کے دیگر اردو اخباروں سے موازنہ کر کے اس کی صحیح قدر و قیمت تعین کریں گے۔شاید ایسا کر کے ہم قوم کی آزادی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے تعلق سے ''جمہور'' کی خدمات کا ہم حق ادا کر سکیں۔

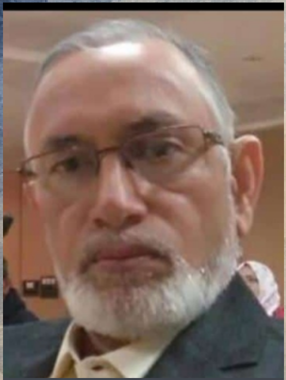

ڈاکٹر اظہر حیات (ناگپور)

افسانچہ

قربانی

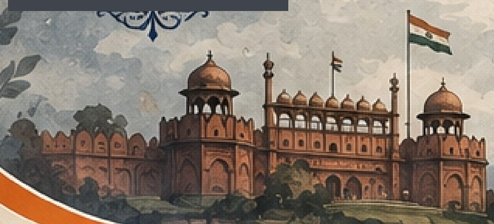

پھانسی سے قبل جیل سپرنٹنڈنٹ نے ابھے کمار سے اس کی آخری خواہش جاننی چاہی۔

ابھے نے خود اعتمادی سے کہا:

"میرا ملک حکومت برطانیہ سے آزاد کیا جائے۔"

سپریٹنڈنٹ نے تمکنت سے کہا:

"یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔"

پھر خانہ پوری کر کے ابھے کمار کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اس نے تختہ دار سے با آواز بلند چلایا:

" ہندوستان زندہ باد، ہندوستان کی آزادی زندہ باد" اور اپنی جان قربان کردی۔

جیل میں ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

ابھے کی بیوی کو اطلاع ملی کہ ابھے کی نعش گھر لائی جارہی ہے تو اسے ہارٹ اٹیک آ گیا، اسی وقت اس نے آنکھیں پھیر دیں۔

بوڑھی ماں بھی دماغی توازن کھو بیٹھی۔

اس طرح ابھے کا پورا خاندان وطن عزیز کی آزادی میں کام آ گیا۔

گاؤں میں ابھے کمار کا اُنتم سنسکار کر دیا گیا۔

ابھے کمار کی بوڑھی ماں گاؤں کی گلیوں میں ادھر ادھر پاگلوں کی طرح گھومتی رہتی۔

ایک سال بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کا سورج نمودار ہوا چاہتا تھا، ملک میں ہر طرف قومی ترانے کا شور تھا۔ بھارت ماتا کی جے جے کار تھی، سارا شہر خوشی سے سرشار تھا۔ تبھی گاؤں کے تالاب کے کنارے سے کچھ لوگوں نے چلایا۔ دیکھو دیکھو وہ بڑھیا ڈوب رہی ہے۔ کچھ لوگ دوڑے بھی مگر ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ بڑھیا بچ نہ سکی اور وہ ڈوب گئی۔

دوسرے دن کے اخبار میں آزادی کی خبریں شہ سرخیوں میں شایع ہوئیں۔ ایک کونے میں یہ خبر بھی ان الفاظ میں شایع ہوئی۔

"آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی ایک بوڑھی فقیرن نے تالاب میں کود کر خودکشی کر لی۔ خودکشی کی وجوہات معلوم نہ ہوسکیں۔"

ڈاکٹر اظہر حیات

"ودربھ گورو پرسکار" سے سرفراز

الابراہیم ایجوکیشن سوسائٹی ناگپور کے زیرِ اہتمام ونامتی ہال، ناگپور میں ایک عظیم الشان تقسیمِ انعامات کی تقریب ماہ جولائی کے آخر میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت دتا میگھے یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر وید پرکاش مشر نے فرمائی، جبکہ مہاراشٹر راجیہ اردو اکادمی کے کارگزار صدر سید حسین اختر مہمانِ خصوصی تھے۔ ڈاکٹر مجید پاریکھ اور سابق رکنِ قانون ساز کونسل (ایم ایل سی) ڈاکٹر وجاہت مرزا مہمانانِ اعزازی کی حیثیت سے شریکِ محفل رہے۔

تقریب کے آغاز میں تمام معزز مہمانوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مسلم آبادی سے دور دھرم پیٹھ میں واقع وسیع و عریض ونامتی ہال حاضرین کی غیرمعمولی تعداد کے باعث تنگ دامانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔

اس موقع پر معروف یونین لیڈر جناب ایس۔ کیو۔ زماں کو ان کی گراں قدر سماجی اور سیاسی خدمات کے اعتراف میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

معروف اردو ادیب، محقق اور اسکالر ڈاکٹر اظہر حیات کو ان کی علمی، ادبی، ثقافتی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں "ودربھ گورو پرسکار" سے سرفراز کیا گیا۔ یہ اعزاز مرحوم بیرسٹر یوسف شریف کے نام سے منسوب ہے۔

تقریب میں دسویں اور بارہویں جماعت کے نمایاں کامیاب طلبہ و طالبات، یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ، پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والے اسکالرز، نیز نیٹ اور جے ای ای میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ مسلم وکلا، صحافیوں اور کھیل کے میدان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے نوجوانوں کی خدمات کا بھی اعتراف کیا گیا۔

جناب سہیل انصاری نے اپنی خوش اسلوبی، شگفتہ انداز اور برجستہ نظامت سے تقریب کو چار چاند لگا دیے۔ تقریب کے کنوینر اور الابراہیم ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر جناب خان نائیڈو ہر آنے والے مہمان کا خیرمقدم کرتے اور تقریب کی کامیابی پر سراپا متشکر دکھائی دے رہے تھے۔

آپ کے خطوط

۱۔شمارہ باصرہ

ماشآء اللہ! پندرہ روزہ ”گلبن“ کا ۱۹ واں شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ بلا شبہ ”خدا بخش لائبریری“ کا مخصوص شمارہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ”گلبن“ جیسے معیاری اور عمدہ رسالہ کا حسن و بہار اور شادابی یوں ہی برقرار رہے۔

اللہ رب العزت ”گلبن“ کو مزید بلندی اور ترقی سے ہم کنار کرے نیز مدیرِ اعلی اور اراکینِ مجلسِ ادارت و مشاورت کو سلامت رکھے۔۔۔آمین!

محمد مجیب احمد

حیدرآباد، تلنگانہ۔

۲۔معلوماتی و دیدہ زیب

خدا بخش لائبریری ۔۔۔ خاص شمارہ نظرنواز ہوا، کیا کہنے ماشاءاللہ بہت معیاری اور معلوماتی مضامین سے آراستہ نہایت عمدہ اور اور دیدہ زیب ہے۔ مدیر محترم کے ساتھ تمام مضمون نگاروں کو بہت مبارکباد۔

تاشقین سید

(جدہ)

۳۔بلند معیار رسالہ

میں کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں مجھے شکوہ اپنی کم مائیگی سے ہے جس نے شکریہ بھی صحیح الفاظ میں پیش کرتے ہوئے شرمندہ کردیا۔

سب سے پہلے آپ نے مجھے یاد رکھا یہ اللہ کا فضل و کرم ہے۔ اور آپ کے اخلاق کی معراج۔

رسالہ نظروں کے سامنے ہے اور ابھی پوری طرح پڑھ نہ سکا ہاں یہ بات ضرور ہے کی جتنا پڑھا سارا کا سارا اپنے معیار کی بلندی پر ہونے کی دلیل پیش کر رہا ہے۔

اللہ سے دعا ہے آپ احباب کو اردو کی ترقی کے لئے اسی طرح کام کرتے رہنے کا حوصلہ اور استقامت عطا کرے آمین

بدرالدین کامل

(حیدرآباد)

۴۔اثاثہ

ابھی ابھی آپ کا خدا بخش لائبریری پر خصوصی شمارہ دیکھا۔

ماشاءاللہ دل خوش ہوگیا۔ یہ کتب خانہ برعظیم پاک و ہند کا اثاثہ ہے۔

اس عظیم اثاثے کی اہمیت و خدمات کو اجاگر کرنے کی سعی پر مبارک باد قبول فرمائیں۔

خدائے متعال آپ کی مساعی کو قبول فرمائے۔

محمد نعمان چشتی

(پاکستان)